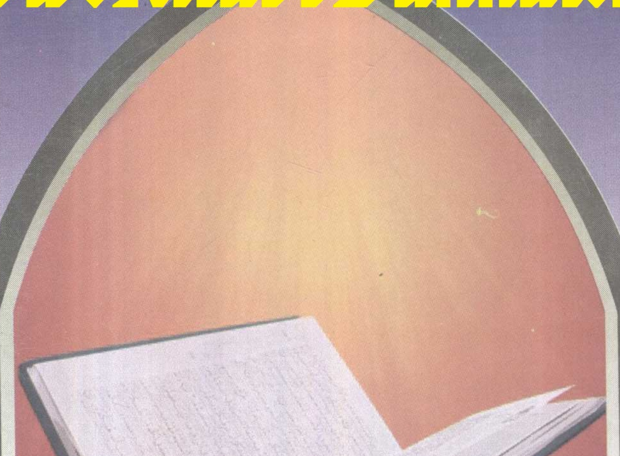
قرآن کا فلسفۂ اخلاق



مولانا سید احمد عروج قادریؒ

قرآن کا فلسفۂ اخلاق

مصنف
مولانا سید احمد عروج قادریؒ

مرتب
ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

MARKAZI MAKTABA ISLAMI PUBLISHERS
NEW DELHI
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

مطبوعات ہیومن ویلفیر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) نمبر ۱۳۳۶

نام کتاب : قرآن کا فلسفۂ اخلاق

مؤلف : مولانا سید احمد عروج قادریؒ

مرتب : ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

صفحات : ۱۷۶

اشاعت : ستمبر ۲۰۱۴ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : -/۹۵ روپے

ناشر : مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

ڈی ۳۰۷، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

فون: ۲۶۹۷۱۶۵۲، ۲۶۹۵۴۳۴۱ فیکس: ۲۶۹۴۷۸۵۸

E-mail: mmipublishers@gmail.com
Website: www.mmipublishers.net

مطبوعہ : ایچ-ایس آفسٹ پرنٹرز، دہلی-۶

QURA'N KA FALSAFA-E-AKHLAQ (Urdu)
By: Maulana Sayyid Ahmad Urooj Qadri
Compile by: Dr. Muhammad Raziul Islam Nadvi
Pages:176
Price: ₹95.00

ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

مولانا سید احمد عروج قادریؒ تحریک اسلامی کے اکابر میں سے تھے۔ انھوں نے ربع صدی تک جماعت اسلامی ہند کے ترجمان ماہ نامہ 'زندگی' رام پور کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اس عرصے میں انھوں نے اسلامیات کے مختلف موضوعات: تفسیرِ آیات، تشریحِ حدیث، سیرت نبوی، فقہ، تصوف، دعوت اور تحریک وغیرہ پر ہزاروں صفحات سپردِ قلم کیے ہیں۔ ان کی وفات (۱۷ر مئی ۱۹۸۶ء) کے بعد جب ماہ نامہ زندگی کی ادارت جماعت اسلامی ہند کے موجودہ امیر مولانا سید جلال الدین عمری (جو اس وقت ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ کے سکریٹری تھے) کے سپرد کی گئی تو ان کی ہدایت پر اور انھی کی رہ نمائی میں راقم سطور نے مولانا قادریؒ کی تمام تحریروں کو اکٹھا کر کے ان کے متعدد مجموعے تیار کر دیے تھے۔ ان میں سے 'تصوف اور اہلِ تصوف' اور 'احکام ومسائل' (فقہی ومعاشرتی سوالات کے جوابات) عرصہ ہوا شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ بقیہ مجموعے بعض اسباب سے اب تک شائع نہ ہو سکے تھے۔ اس عرصے میں مولانا مرحوم کے صاحب زادے مولانا لطف اللہ قادری فلاحی کی کوشش سے ان کی تحریروں کے کچھ اور مجموعے منظر عام پر آئے۔ اب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے سیرتِ نبویؐ، دعوتِ دین اور تحریک اسلامی کے موضوعات پر مزید تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور یہ چوتھا مجموعہ زیرِ نظر کتاب کی صورت میں نذرِ قارئین ہے۔

انسان جہاں ایک طرف جسمانی اور مادی وجود رکھتا ہے وہیں اس کا اخلاقی اور روحانی وجود بھی ہے۔ دونوں پہلوؤں کے اشتراک سے اس کی مثالی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اگر اس کی شخصیت کے اخلاقی وروحانی پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ نرا جانور رہ جاتا ہے۔ خدائی ہدایت

سے بے نیاز ہو کر جن لوگوں نے انسان کی شخصیت اور کردار پر غور و خوض کیا ہے انھوں نے صرف اس کے جسمانی اور مادّی وجود سے بحث کی ہے۔ جب کہ اسلام اس کی مکمل شخصیت کو سنوارتا اور نکھارتا ہے۔ قرآنِ کریم میں اخلاق کا ایک جامع تصور پیش کیا گیا ہے، جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے تمام گوشوں میں کون سے کام ہیں جن سے اللہ کی رضا حاصل ہوتی ہے اور کون سے کام اس کے غضب کو بھڑکاتے ہیں۔ انبیائے کرام کی بعثت اسی اخلاق کی نشو ونما اور استحکام کے لیے ہوتی رہی ہے اور اسی کی تکمیل کے لیے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔

زیرِ نظر کتاب میں اس موضوع پر تفصیل سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مولانا سیّد احمد عروج قادریؒ نے ابتدا میں انسان کے اخلاقی وجود سے بحث کرتے ہوئے یونانی فلاسفہ کی نارسائیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد قرآن کے فلسفۂ اخلاق سے مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ اس کتاب میں سورۃ النحل آیت ۹۰ کی جامع تشریح کی گئی ہے اور اس میں مذکور مکارمِ اخلاق اور رذائل اخلاق پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

مولانا کی اس تحریر کی اشاعت 'انسان کا اخلاقی وجود' کے عنوان سے ماہ نامہ زندگی رام پور کی دس قسطوں میں ہوئی تھی (پہلی قسط جنوری ۱۹۵۶ء میں اور آخری قسط اگست ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی) موضوع کی مناسبت سے اس کا عنوان تبدیل کر کے 'قرآن کا فلسفۂ اخلاق' کر دیا گیا ہے اور قارئین کی سہولت کے لیے اسے ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کے حوالے مولانا نے رکوع کے اعتبار سے دیے تھے۔ ان کے بجائے آیات کے نمبر درج کر دیے گئے ہیں۔ اسی طرح جن احادیث کے حوالے نہیں تھے، انہیں بھی مکمل کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کا فائدہ عام کرے اور اس کے اجر سے مصنف مرحوم اور مرتب کو نوازے۔ آمین

محمد رضی الاسلام ندوی
سکریٹری تصنیفی اکیڈمی جماعت اسلامی ہند

۸ رشعبان ۱۴۳۵ھ
۷ رجون ۲۰۱۴ء

باب اوّل

انسان کا اخلاقی وجود

ہمارا ملک کدھر جا رہا ہے؟ ہمارے لیے یہ وقت کا بڑا اہم سوال ہے، جس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں اس ملک نے طویل جدوجہد کے بعد انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کی اور زمام کار خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ جہاں تک اس ملک کی مادّی ترقی کا تعلق ہے، پنڈت جواہر لال نہرو کی رہنمائی میں یہ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔(☆) ایک پنج سالہ پلان ختم ہو چکا ہے اور دوسرے پنج سالہ پلان کی ابتدا ہو رہی ہے۔ فی الحقیقت یہ ملک صنعتی انقلاب کے دروازے میں داخل ہو چکا ہے اور شاید زیادہ دن نہیں گزریں گے کہ بھارت دنیا کا ایک بڑا صنعتی ملک بن جائے گا۔ کوئی غیر جانب دار شخص ہندوستان کے سربراہ کاروں کی محنت، کوشش، جاں فشانی اور لگن کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن دوسری طرف جب ہم اپنے ملک کی اخلاقی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو مستقبل کے بارے میں سخت اندیشے پیدا ہونے لگتے ہیں اور یہ سوال سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کہ جو لوگ اس ملک کی مادّی ترقی کے لیے اس قدر چوکنا اور بیدار ہیں وہ اس پہلو سے غفلت کیوں برت رہے ہیں؟ کوئی معقول انسان یہ باور نہیں کر سکتا کہ کسی ملک کی ترقی نام ہے صرف اس کی مادّی ترقی کا، لیکن انسانیت کے لیے یہ ایک عظیم سانحہ ہے کہ یورپ کی موجودہ تہذیب نے انسان کے دل و دماغ پر مادّیت کو ایک کابوس کی طرح سوار کر دیا ہے اور وہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اپنے تمام مسائل کو صرف مادّی نقطۂ نظر سے سوچنے کا عادی ہو گیا ہے۔ آپ پہلے پنج سالہ پلان کو بھی دیکھیں اور دوسرے پنج سالہ پلان کا بھی مطالعہ کریں، آپ اوّل نظر میں یہ بات پا لیں گے کہ یہ پلاننگ ہماری پوری زندگی کو سامنے رکھ کر نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ محض یک طرفہ اقتصادی پلاننگ ہے۔ کسی ملک کی حقیقی ترقی کے

(☆) واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۵۶ء کی ہے (مرتب)

لیے متوازن، وسیع اور ہمہ جہتی پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا پنج سالہ پلان بالکل ناکافی اور ناکام ہے۔ اگر اس ملک کے سربراہ کاروں نے اس پہلو پر توجہ نہ کی تو یک طرفہ ترقی کے جو نتیجے یورپ اور امریکہ میں نکل چکے ہیں وہی اس ملک میں بھی نکل کر رہیں گے۔ انسان کو محض حیوان فرض کر لینے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ انسان، جسم اور روح دونوں سے مرکب ہے۔ جب تک ان دونوں کے تقاضے پورے نہیں کیے جائیں گے اس کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ جس طرح انسان ایک حیوانی اور طبعی وجود رکھتا ہے، ٹھیک اسی طرح اخلاقی و روحانی وجود بھی رکھتا ہے، بلکہ اس کا یہی دوسرا وجود اسے انسان بناتا اور اسے کتّوں اور گدھوں سے ممتاز کرتا ہے۔ میں اس کتاب میں انسان کے اسی دوسرے وجود کو روشناس کرانا چاہتا ہوں۔

ایک حیرت انگیز مخلوق

اگر کوئی شخص سوال کرے کہ کرۂ ارض پر خدا کی عجیب ترین اور پیچیدہ ترین مخلوق کون ہے؟ تو شاید سب سے زیادہ صحیح جواب یہ ہوگا: انسان!

یہ عجوبگی اور پیچیدگی اس کے بیرونی وجود میں نہیں ہے، بلکہ تمام بوالعجبی، حیرت انگیزی اور پیچیدگی اس کے اندرونی وجود میں چھپی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس مخلوق کو عقل و فہم، نطق و گویائی اور ارادہ و اختیار کی قوتیں دے کر اسے اپنی تمام دوسری مخلوقات سے ممتاز کر دیا ہے۔ انسان جب اپنے جذبات، نفسیات، میلانات اور خیر و شر کی متنوع و متضاد قوتوں پر غور کرتا ہے تو خود حیران رہ جاتا ہے۔ اس کا دماغ ایسی وسیع اور اتنی پیچیدہ مشنری ہے، جس سے زیادہ وسیع اور پیچیدہ مشنری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک ایسا کارخانۂ افکار، ایسی کارگاہِ خیالات، ایسا خزانۂ معلومات اور ایک ایسا گنجینۂ معارف و علوم ہے، جس کی نظیر سے دنیا خالی ہے، وہ ایک ایسا آئینہ، ایک ایسا کیمرہ، ایک ایسی دوربین، ایک ایسی خوردبین اور ایک ایسی اکسرے مشین ہے، جو صرف محسوسات ہی کی تصویریں نہیں چھاپتی، بلکہ معقولات و مفہومات کے نقشے بھی اتار لیتی ہے۔ انسان نے سیکڑوں اور ہزاروں حیرت انگیز چیزیں ایجاد کر لی ہیں، لیکن وہ خود اپنے دماغ کا کوئی مکمل نمونہ ایجاد کرنے سے قاصر ہے۔ انسان اپنے دماغ کی طاقت کو محسوس کرتا ہے اور پھولا نہیں سماتا، وہ اپنی عقل و ذہانت پر اعتماد کرتا ہے اور عقل ملی ہی اسی لیے ہے کہ اس پر اعتماد کیا

جائے، لیکن اس کا اعتماد اتنا بڑھا کہ اپنا مقصدِ وجود بھی اسی سے دریافت کرنے لگا اور جدھر اس نے انگلی اٹھا دی ادھر ہی سفر بھی شروع کر دیا اور یہیں اس نے ٹھوکر کھائی۔ ظاہر ہے کہ جب انسان اپنا مقصدِ وجود ہی صحیح متعین نہ کر سکے تو پھر اسے زندگی کا سیدھا اور صحیح راستہ کس طرح مل سکتا ہے؟

آج انسان بہت سارے مسائل (Problems) کو حل کرنا چاہتا ہے۔ حالاں کہ وہ اب تک اپنے مقصدِ وجود کا سب سے بڑا مسئلہ حل نہیں کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اِن تمام مسائل کو، جنہیں وہ طے کرنا چاہتا ہے، صرف اس لیے طے نہیں کر پا رہا ہے کہ اس نے اپنے سب سے بڑے مسئلہ کو طے نہیں کیا ہے۔ میرے نزدیک خود اس کا وجود مسئلہ نمبر ایک ہے۔ جس دن اس نے اپنے اس مسئلے کو حل کر لیا اسی دن گویا اس نے اپنے تمام مسائل کو حل کر لیا۔ میں اس وقت دراصل اسی مسئلے کی طرف چند اشارات کرنا چاہتا ہوں۔ آگے بڑھنے سے پہلے انسان کی ہستی کا تجزیہ کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اسی تجزیے میں اس مسئلہ کا راز بھی مخفی ہے۔

انسان کی دو حیثیتیں

ہستیِ انسان کا تجزیہ کیا جائے تو تھوڑے تأمل سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ انسان دو الگ الگ حیثیتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ دونوں حیثیتیں مختلف بھی ہیں اور متحد بھی۔ مختلف اس لحاظ سے کہ دونوں کے قوانین و احکام الگ الگ ہیں اور متحد اس حیثیت سے کہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہو کر کام نہیں کر سکتیں، بلکہ مل جل کر انسانی ہستی کو مکمل کرتی ہیں۔ انسان کی پہلی حیثیت یہ ہے کہ وہ اپنا ایک حیوانی و مادّی وجود رکھتا ہے اور اس کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک روحانی و اخلاقی وجود بھی پوشیدہ ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک انسان کا جسم ہے اور دوسری اس کی روح۔ یہ روح یا نفس، انسانی جسم سے بالکل علیحدہ شئے ہے، دونوں ایک نہیں ہیں۔ ہر دو کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا اتنی واضح بات ہے کہ اس پر کوئی دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن جب انسان کا حیوانی وجود اس کے روحانی وجود پر غالب ہو جاتا اور قاہرانہ تسلط حاصل کر لیتا ہے تو بسا اوقات اسے اپنے روحانی وجود اور اپنی اخلاقی حیثیت کا احساس تک باقی نہیں رہتا اور وہ اپنے آپ کو محض ایک حیوان سمجھنے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر یہ ضرورت پیش آجاتی ہے کہ جسم و روح کے دو علیحدہ وجود ہونے پر گفتگو کی جائے۔ ہزاروں سال

پہلے بھی اس کی ضرورت پیش آئی تھی اور اس عہد کے حکماء وعقلا نے اس پر گفتگو کی تھی اور آج تو انسانوں کی ایک بڑی تعداد نے زندگی کا ایک مستقل نظریہ ہی یہ بنالیا ہے کہ انسان اصلاً صرف دو اعضا کے مجموعے کا نام ہے: پیٹ اور شرم گاہ۔ ان لوگوں کے نزدیک انسان کی تمام صلاحیتوں اور قابلیتوں کا اصل مقصود یہ ہے کہ وہ اپنے حیوانی وجود کو زیادہ سے زیادہ آرام اور زیادہ سے زیادہ لذت بخش سکے۔ یہ لوگ اِک ذرا تأمل سے کام لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ انسان اپنے پاس صرف جسم ہی نہیں رکھتا، بلکہ کچھ اور بھی رکھتا ہے۔

یہ کچھ اور جسم سے اپنی حقیقت میں بھی الگ ہے، اپنے خواص میں بھی علیحدہ ہے اور اپنے افعال میں بھی جدا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیزیں ان تمام باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوں وہ ایک نہیں ہوسکتیں اور کوئی احمق ہی انہیں ایک قرار دے سکتا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ انسان سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں اور اس کے اندر جو خاصے اور قوتیں پوشیدہ ہیں، ان کی نوعیت کیا ہے؟

انسان ایک ٹھوس وجود ہے جو جگہ گھیرتا ہے۔ اس میں طول، عرض اور عمق پایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی، چوڑائی، گہرائی محدود ہے اور جس شے کی حقیقت یہ ہو اسے ہم جسم کہتے ہیں۔ اس سے اتنا معلوم ہوا کہ انسان بھی جسم ہے یا جسم رکھتا ہے۔ پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ جسم سانس لیتا ہے، دیکھتا سنتا ہے، کھاتا پیتا ہے، سوتا جاگتا ہے اور نسل کشی کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان تمام افعال میں طبعی حالات، مادی وسائل کے فرق اور عمر کے تفاوت کے لحاظ سے کمی بیشی، ضعف وقوت اور فتور واختلال بھی واقع ہوتا رہتا ہے۔

دوسری طرف ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس جسم کے اندر ایک ایسی شے بھی ہے جو ہمیشہ سرگرم عمل رہتی ہے اور کبھی نہیں تھکتی، بلکہ جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھاپے کی طرف بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے اس شے کا عمل قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے اور خود وہ شے اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہوتی جاتی ہے۔ وہ تمام اشیاء کا یکساں ادراک کرتی ہے اور اس میں نہ فتور واقع ہوتا ہے، نہ تکان لاحق ہوتی ہے اور نہ نقص پیدا ہوتا ہے۔ اس کی غذا آب و نان جیسی چیزیں نہیں ہوتیں، بلکہ خیالات، رجحانات، نظریات اور علوم ومعارف اس کی غذا بنتے ہیں۔

یہ صفات وافعال جسم کے صفات واعمال سے الگ ہیں، اس لیے یہ شے جسم نہیں ہوسکتی، بلکہ کچھ اور ہے اور یہی کچھ اور انسان کا نفس ناطقہ ہے۔

ایک اور پہلو سے اس پر غور کرنا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جسم کی کوئی نہ کوئی شکل وصورت ہوتی ہے۔ اس صورت کے علاوہ وہ جسم اس وقت تک اس جنس کی کوئی دوسری صورت قبول نہیں کرسکتا جب تک وہ پہلی صورت چھوڑ نہ دے۔ ایسا ناممکن ہے کہ اس کی پہلی صورت بھی باقی رہے اور وہ دوسری صورت بھی قبول کرلے۔ مثال کے طور پر کوئی مثلث جسم اس وقت تک مدوّر نہیں ہوسکتا جب تک اس کی تثلیث بالکل ختم نہ ہوجائے۔ یہ ممکن نہیں کہ بہ یک وقت وہ تکونا بھی ہو اور گول بھی۔

کاغذ کے کسی صفحے پر یا چاندی کے کسی ورق پر آپ کوئی نقش ثبت کردیں تو اب اس نقش کی جگہ پر کوئی دوسرا نقش اس وقت تک ثبت نہیں ہوسکتا جب تک وہ پہلا نقش محو نہ کردیا جائے۔ اگر پہلے نقش کا کوئی حصہ یا اس کا دھندلا سا خاکہ بھی باقی رہ گیا تو دوسرا نقش صاف نہیں آئے گا، بلکہ دونوں گڈمڈ ہوجائیں گے۔ لیکن انسانی جسم کے اندر ایک صفحہ ایسا بھی ہے جس پر ہزاروں نقش یکے بعد دیگرے ثبت ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے کسی کو محو کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، ہر نقش اپنی جگہ بالکل مکمل، صاف اور ایک دوسرے سے نمایاں ہوتا ہے اور پھر یہ کہ اس پر صرف محسوسات ہی کے نقوش ثبت نہیں ہوتے، بلکہ معقولات کی تصویریں بھی چھپتی ہیں۔ جو نقش بھی اس کے سامنے آتا ہے وہ اسے اپنے اندر جذب کیے بغیر نہیں چھوڑتا اور یہ ایک ایسا خاصہ ہے جو خواصِ اجسام کی بالکل ضد ہے۔ یہ صفحہ کیا ہے؟ انسان کا نفسِ ناطقہ!

یہ صحیح ہے کہ نفسِ ناطقہ و عاقلہ علوم وفنون کے اکثر مبادی جسم کے حواس ہی سے حاصل کرتا ہے، لیکن بہت سارے مبادی وافعال ایسے بھی ہیں جو خود اس کے اندر موجود ہیں، جسمانی حواس سے ان کا تعلق نہیں ہے اور یہی وہ مبادی عالیہ ہیں جن پر صحیح قیاسات کی بنیاد قائم ہے۔ انھی کے ذریعے انسان صحیح نتائج تک پہنچتا ہے اور انھی کے ذریعے وہ حواس جسمانی کی غلطیوں کی اصلاح کرتا ہے۔ انسان کے جسمانی حواس دن رات بیسیوں غلطیاں کرتے رہتے ہیں۔ اگر نفس عاقلہ نہ ہوتا تو ان کی اصلاح ناممکن تھی۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی۔

انسان کی بصارت اکثر غلطی کرجاتی ہے۔ آسمان پر ہلکے بادلوں کے ٹکڑے روئی کے گالوں کی طرح چھائے ہوئے ہیں، چاندنی چٹکی ہوئی ہے۔ انسان آسمان کی طرف نگاہیں اٹھاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ چاند تیزی سے کبھی آگے بھاگ رہا ہے اور کبھی پیچھے۔ اک ذرا دیر کے لیے وہ اس منظر سے حیران ہوتا ہے، لیکن تھوڑی دیر میں اسے معلوم ہوتا ہے کہ غلطی اس کی اپنی ہے۔ چاند

اپنی جگہ پر ہے۔ یہ روئی کے گالے ہیں جو چاند کے سامنے سے بھاگ رہے ہیں۔ حرکت روئی کے گالوں میں ہے نہ کہ چاند میں۔ ٹیبل پر برقی پنکھا تیزی سے گھوم رہا ہے، آنکھ دیکھتی ہے کہ کوئی ایک شے دائرے کی شکل میں تیزی سے چکر کاٹ رہی ہے، لیکن جیسے ہی پنکھا بند ہوتا ہے وہ دیکھتی ہے کہ وہ ایک شے نہیں ہے، بلکہ تین پتیاں اچھے خاصے فاصلے پر الگ الگ قائم ہیں، جنہیں وہ ایک دیکھ رہی تھی۔

پانی میں کوئی چیز اسے ٹیڑھی نظر آتی ہے، لیکن جب وہ باہر آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو بالکل سیدھی تھی۔ کوئی شے اسے ٹوٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے، لیکن جب وہ پانی سے اسے باہر کھینچ لیتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی بالکل ٹھیک تھی۔ یہ تمام غلطیاں جو آنکھ کرتی ہے، اس کے اسباب کون تلاش کرتا ہے اور پھر ان پر صحیح حکم کون لگاتا ہے؟ نفس عاقلہ! اور اس نتیجے تک پہنچنے میں وہ جسمانی حواس میں سے کسی حس کو ذریعہ نہیں بناتا، خود اس کی ذات میں ایسی قوتیں موجود ہیں جن سے وہ کام لیتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ بحث ہے اور اس کا سلسلہ دراز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہاں ضمناً چند اشارے مقصود تھے۔ ان مختصر اشارات سے اتنی بات واضح ہوتی ہے کہ انسان صرف جسم ہی جسم نہیں ہے، بلکہ جسم تو انسان کا ایک فانی اور ناقص وجود ہے۔ اس کا اصل وجود تو وہ ہے جسے ہم نے روحانی و اخلاقی وجود کہا ہے۔ انسان جس چیز کی بنا پر حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے وہ اس کا یہی دوسرا وجود ہے، ورنہ اس کی پہلی حیثیت تو تمام حیوانات میں عام اور مشترک ہے۔ ہم اِس بحث میں یہاں پڑنا نہیں چاہتے کہ انسان ابتدا ہی سے جامۂ انسانیت پہن کر اس دنیا میں آیا ہے یا اس نے جامۂ حیوانیت اتار کر لباس انسانیت زیب تن کیا ہے۔ بالفرض اگر دوسری بات تسلیم کر لی جائے تب بھی یہ بات کوئی احمق یا حیوانیت پرست ہی کہہ سکتا ہے کہ انسان موجودہ حالت میں بھی نرا جانور ہے۔

انسان کے نفس ناطقہ میں سب سے افضل اور اعلیٰ درجہ کی قوت عقل ہے، اس لیے پہلے اسی پر ہم مختصر سی گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

عقل انسانی اور اس کے تین درجے

عقل، نفس ناطقہ کی وہ فطری و طبعی قوت ہے جس کے ذریعہ انسان علوم و فنون کا ادراک کرتا ہے اور یہ وہ وصف ہے جس کی بنا پر انسان دوسرے تمام حیوانات سے ممتاز ہوتا ہے۔ اگر اسے

چھین لیا جائے تو پھر انسان اور حیوان میں کوئی حقیقی فرق باقی نہیں رہ جائے گا۔ یہ قدرتی نور ہے جو انسانی قلب و دماغ میں اشیاء کے ادراک اور ان سے اخذ نتائج کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ یہ ایک سرچشمہ ہے جس سے تین نہریں نکلتی ہیں اور یہ ایک درخت ہے جس سے تین قسم کے پھل حاصل ہوتے ہیں: اس کا پہلا درجہ وہ ہے جو خود قوت عاقلہ کی طرح ہر ذی شعور انسان میں طبعی طور پر موجود ہوتا ہے اور اسی درجے سے وہ علوم حاصل ہوتے ہیں جنہیں ہم علوم ضروریہ کہتے ہیں، یعنی وہ علوم جو بلا غور وفکر انسان کو حاصل ہوتے ہیں، مثلاً اپنے وجود کا علم انسان کو بداہتہً حاصل ہوتا ہے، اس میں کسی غور وفکر کی ضرورت نہیں پڑتی، یا ہر ذی شعور یہ جانتا ہے کہ دو ایک سے زیادہ ہوتا ہے اور یہ کہ شخص واحد ایک وقت میں دو مقام پر موجود نہیں ہوسکتا۔ عقل کا دوسرا درجہ وہ ہے جو طبعی طور پر موجود نہیں ہوتا، بلکہ غور وفکر اور کسب واکتساب سے حاصل ہوتا ہے اور اسی درجے سے وہ علوم حاصل ہوتے ہیں، جس کی بنیاد احوال وکوائف کے تجربات پر ہوتی ہے۔ جیسے جیسے انسان کے تجربات بڑھتے جاتے ہیں یہ درجہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو ان لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ عقل مند سمجھا جاتا ہے جنہیں تجربات حاصل نہیں ہوتے۔ یہی دوسرا درجہ ارتقائی منازل طے کر کے عقل کا تیسرا انتہائی درجہ بن جاتا ہے۔ اس درجے پر پہنچ کر انسان کو عواقب امور کی معرفت حاصل ہوتی ہے، یعنی جب کوئی بات اس کے سامنے آتی ہے تو وہ سب سے پہلے اس کے انجام اور اس کے نتیجے پر غور کرتا ہے۔ انسان کا نفس اپنی ہر خواہش پوری کرنی چاہتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا، لذت اور فوری لذت اس کا منتہائے نظر ہے۔ لیکن عقل کی یہی تیسری قسم انسان کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ اپنے نفس کو مغلوب کرے اور انجام کار سوچے بغیر اس کے مطالبات پورے نہ کرے۔ عقل کا یہی وہ پاسبان ہے جو مہلک اور خطرناک داعیاتِ نفس کی تعمیل سے باز رکھتا ہے۔ عقل کا یہی وہ اعلیٰ درجہ ہے جو انسان کو اپنی صلاح وفلاح اور اپنے حقیقی نفع ونقصان کے علم کی طرف رہنمائی کرتا اور اس کے سامنے زندگی وموت کے مسائل پیش کرتا ہے اور یہی وہ مرتبۂ عقل ہے جس کی زمین سے علم الاخلاق کا ایک عظیم سرچشمہ پھوٹتا اور انسان کو ایک مستقل اخلاقی وجود عطا کرتا ہے۔

تفاوتِ عقل

عقل ہر انسان کو دی گئی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام انسانوں کی عقلیں مساوی

ہیں یا تمام انسان عقل کے لحاظ سے ایک ہی درجہ رکھتے ہیں۔ عقل کا صرف پہلا درجہ ایسا ہے جس میں تفاوت نہیں ہوتا، کیوں کہ 'علوم ضروریہ' میں تمام انسان مساوی ہوتے ہیں، الاّ یہ کہ کوئی شخص مخبوط الحواس ہو۔ ہر شخص یکساں طور پر یہ جانتا ہے کہ دو، ایک سے زیادہ ہے، ہر شخص مساوی طور پر یہ علم رکھتا ہے کہ کوئی شے بیک وقت موجود و معدوم نہیں ہو سکتی، بیک وقت وجود و عدم کا اجتماع محال ہے۔ لیکن جہاں تک خود قوتِ عاقلہ اور اس کے دوسرے اور تیسرے درجوں کا سوال ہے، ان میں بے انتہا تفاوت ہوتا ہے۔ نہ ہر شخص کی قوتِ عاقلہ برابر ہوتی ہے، نہ علوم تجربی یکساں ہوتے ہیں اور نہ عواقب امور کا علم اور خواہشاتِ نفس پر کنٹرول مساوی ہوتا ہے۔ عقولِ انسانی کا یہی تفاوت ہے جس کی بنا پر دنیا افکار و خیالات، آئیڈیالوجی اور نظریات کا عجائب خانہ بنی ہوئی ہے۔ یہ تفاوت قوتِ عاقلہ کی قوت و ضعف اور کمیت و کیفیت کے فرق کے لحاظ سے بھی ہوتا ہے اور اس قوت کے طریق استعمال کے اعتبار سے بھی۔ کسی نتیجہ کی صحت و عدم صحت میں اشیاء کے طریق استعمال کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی حال عقل کا بھی ہے۔ اگر اسے صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو نتیجہ صحیح نکلتا ہے اور اگر غلط طریقے سے استعمال کیا جائے تو نتیجہ غلط برآمد ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور ذہن نشیں رکھنے کی یہ ہے کہ عقل ہمیشہ نفس امّارہ پر حاکم ہی نہیں ہوتی، بلکہ کبھی محکوم بھی ہو جاتی ہے اور نفس ہی انسان کا اصلی حاکم بن بیٹھتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی یہ ہوتا ہے کہ عقل کسی ایک حقیقت تک پہنچا رہی ہوتی ہے، لیکن بعض تعصّبات یا کسی چیز سے شدید نفرت اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے مانع بن جاتی ہے۔ میں اس چیز کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔

یہ کرۂ ارض، جس پر ہم سانس لے رہے ہیں اور یہ وسیع کائنات، زمین جس کا ایک محض مختصر حصہ ہے، عجائبات سے بھری ہوئی ہے۔ اگر کوئی عقل و فہم رکھنے والا انسان خالی الذہن ہو کر اس میں سے کسی ایک جز کا بھی گہرا مطالعہ کرے تو اس کے نظم و نسق، اس کی باقاعدگی و باضابطگی اور اس کے حسن ترتیب کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے اور اس کی عقل ایک صانع حکیم کے وجود اور اس کی حکمت و تدبیر کے اعتراف پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ طے کر کے مشاہدہ شروع کرے کہ اس کائنات کا کوئی مافوق الفطری صانع نہیں ہے تو اس کائنات کا بڑا سے بڑا عجوبہ بھی اسے متاثر نہیں کرتا اور جو چیز ایک ایسے خالق کے وجود پر واضح دلیل بن رہی ہوتی ہے اسے وہ عدم وجودِ خالق کی دلیل بنا لیتا ہے۔ میں نے جب بعض منکرین خدا کا حسب ذیل بیان پڑھا تو انسان کی

ضد اور ہٹ دھرمی پر مجھے حیرت ہوگئی۔

> ''ایسا خیال کرنا کس قدر مہمل ہے کہ خدا، ہمارے اس مختصر ترین سیارے میں کوئی دلچسپی لیتا ہے، جو اتھر کے ناپیدا کنار سمندر میں، ایک ذرۂ ریگ کی طرح گردش کر رہا ہے۔ ستاروں کے فاصلوں پر غور کرو، وہ ہم پر چھائے ہوئے ہیں، انھوں نے ہمیں مغلوب کر رکھا ہے اور ہمارے اس خیال کو انھوں نے بالکل ختم کر دیا ہے کہ ہم لوگ بھی اس کائنات میں کوئی اہمیت رکھتے ہیں۔
>
> زمین سے ان ستاروں کی بلندی اور ان کی مسافت کا اندازہ اس مثال سے کیا جا سکتا ہے کہ گویا ان ستاروں کی مجموعی روشنی ہم تک بس اتنی ہی پہنچتی ہے جتنی ایک موم بتی کی روشنی بارہ گز کے فاصلہ پر۔ ثوابت میں سے قریب ترین ستارے (Fixed Star) کا فاصلہ نظام شمسی کے قطر سے تین ہزار گنا زیادہ ہے۔ گویا وہ قطرِ نظام شمسی سے دو لاکھ لائٹ ایر کے فاصلے پر ہے۔
>
> بہت سے ستارے جو کروڑوں سال پہلے فنا ہو چکے ہوں گے، ان کی روشنی جو اتھر سے گزر رہی ہے، آج تک زمین تک نہیں پہنچ سکی، حالاں کہ اس روشنی نے اپنا سفر اس وقت شروع کیا تھا، جب کہ زمین کا وجود بھی نہ تھا۔
>
> اور اب تک لوگ، خدا اور زندگی بعد موت کی باتیں کرتے ہیں۔''(۱)

اس بیان کے آخری ٹکڑے کو پڑھ کر ایک معقول انسان متحیر بھی ہوتا ہے اور اسے ہنسی بھی آتی ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ آخری ٹکڑا زبردستی محض اس لیے جوڑ دیا گیا ہے کہ کہیں اس تفصیل کو پڑھ کر کسی کا دل ایک صانع حکیم کا اقرار و اعتراف نہ کر لے۔ خدا اور آخرت کے خلاف یہ وہ تعصب ہے جس نے بہت سارے انسانوں کو نہ صرف دل کا اندھا بلکہ عقل کا اندھا بھی بنا ڈالا ہے۔ جو چیز خدائے کائنات کے وجود اور اس کی حکمت پر واضح اور ناقابل تردید دلیل بن رہی تھی اسے خدا کے نہ ہونے پر دلیل بنانا اور خدا و آخرت کی ہنسی اڑانا عقل کی بات تو ہے نہیں۔ اب اس کو فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ(۲) کے سوا اور کیا کہا جائے ... بے نہایت فضائے بسیط میں زمین کا یہ کرہ، بے کراں کائنات میں ریت کا یہ ذرہ کروڑوں سال سے گردش کر رہا ہے، لیکن بڑے سے بڑے سیارے اور عظیم سے عظیم تر ستارے کی یہ مجال نہیں کہ اسے اپنے میں جذب کر لے۔ یہی سائنس داں، جن میں کے بعض خدا کے

---

(۱) The Book of knowledge, Vol.I, Page 744

(۱) (الحج:۴۶) ترجمہ: بے شک آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ سینوں میں دل اندھے ہو جاتے ہیں۔

وجود کا انکار کرتے ہیں، یہ فرماتے ہیں کہ یہ کرۂ ارض اگر سورج سے ایک انچ بھی اور قریب ہو جائے تو اس کا آتشیں بھنور اُسے ہڑپ کر جائے اور یہ اس میں اس طرح جل بھن کر خاک ہو جائے جیسے ایک پھول جنگل کی آگ میں۔ اور اگر یہ ایک انچ بھی سورج سے دور ہو جائے تو فضائے بسیط میں معلوم نہیں کہاں جا پڑے اور تباہ ہو جائے۔ کیا عقل اس کو باور کرتی ہے کہ یہ توازن خود بخود قائم ہے اور اس میں کسی صانع حکیم کے ارادے کا دخل نہیں ہے۔

اگر کسی انسان نے یہ طے ہی کر لیا ہو کہ وہ خدا کے وجود کو کسی حال میں تسلیم نہیں کرے گا تو بات ہی اور ہے، ورنہ یہ حقیقتیں جب سامنے آتی ہیں تو عقل اور دل دونوں ہی بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں: فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (المومنون: ۱۴) ''بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔''

اس مثال سے یہ واضح کرنا تھا کہ کبھی انسان کی خواہش نفس اور اس کے دوسرے غلط داعیات، عقل کو اپنا تابع بنا لیتے ہیں۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ تمام سائنس داں خدا کے منکر ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی اکثریت آج بھی خدا کے وجود اور اس کی حکمت و تدبر کی معترف ہے۔ اگرچہ انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں ان کا یہ اعتراف بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہا ہے، اس کی کئی وجوہ ہیں۔ میں یہاں انہیں بیان کرنا نہیں چاہتا، آگے اس سلسلے میں کچھ اشارات آئیں گے۔

عقل کی حد

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عقل ہی انسان کا وہ شرف ہے جس کے ذریعہ وہ جانوروں سے ممتاز ہوتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اسے ایک ذمہ دارانہ حیثیت عطا کرتی ہے، نیز یہی وہ شے ہے جو انسان کو اس کے وجود حیوانی سے الگ، ایک اخلاقی وجود کا درجہ دیتی ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کی عقل خود اپنی قوت سے سب کچھ جان سکتی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ عقل بہت سارے مسائل میں رہ نمائی کا کام انجام دیتی ہے، لیکن پوچھا جا سکتا ہے کہ عقل خود کسی رہ نمائی کی محتاج نہیں ہے؟

یہ دو بنیادی سوالات ایسے ہیں کہ ان کے صحیح جوابات جانے بغیر ہم اخلاق انسانی کے مسئلے کو حل نہیں کر سکتے۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، اتنی بات تو تمام عقلائے دہر تسلیم کرتے آئے ہیں کہ بہت سارے مسائل میں عقل بطور خود کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے عاجز ہے۔ اس سے اتنی

بات معلوم ہوئی کہ عقل انسانی کی بھی ایک حد ہے، جس سے آگے بڑھنا اس کے لیے ممکن نہیں اور اسی بات سے دوسرے سوال کا یہ منطقی جواب نکلتا ہے کہ بہت سارے مسائل میں عقل بھی رہ نمائی کی محتاج ہے۔ اگر اسے کوئی صحیح رہ نمائی نہ ملے تو وہ ان مسائل کو قطعیت سے نہیں جان سکتی۔ ایسے موقع پر انسان کے تین رویے ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ وہ ہر ایسی چیز سے انکار کر دے جو اس کی عقل کی دست رس سے باہر ہو۔ دوسرا یہ کہ صحیح رہ نمائی حاصل کیے بغیر کھینچ تان شروع کر دے اور تیسرا یہ کہ اپنی عقل کی ساری طاقت صرف کر کے صحیح رہ نمائی تلاش کرے۔ ہماری عقل خود گواہی دیتی ہے کہ نہ پہلا رویہ درست ہے اور نہ دوسرا۔ پہلے رویّے کی بنیاد اس چیز پر رکھی جاتی ہے کہ جو چیز عقل میں نہیں آتی وہ مخالف عقل ہے اور جو مخالف عقل ہو وہ قبول نہیں کی جا سکتی۔ اس قضیّے کا پہلا جز بالکل غلط ہے۔ کسی چیز کا عقل کی دست رس سے باہر ہونا اور بات ہے اور اس کا مخالف عقل ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ ان دونوں میں کسی قسم کا لزوم نہیں ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص ہر اس چیز کے وجود کا انکار کر دے جو اس کے علم میں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ عدم علم کسی شے کے عدم وجود کو مستلزم نہیں ہے اور عدم علم کو عدم وجود کی دلیل بنانا پرلے درجے کی حماقت ہے۔ مخالف عقل اس شے کو کہتے ہیں جسے عقل کسی صحیح علم کی بنیاد پر رد کرے، نہ یہ کہ ہر وہ شے خلاف عقل ہے جو سمجھ میں نہیں آتی۔ فرض کیجیے کہ کسی شخص کی عقل میں ایٹم بم کی تھیوری اور اس کا سسٹم نہیں سماتا تو کیا اس کو اس بات کی اجازت دی جائے گی کہ وہ اس کا انکار کر دے اور کیا اس کے انکار کو معقول رویہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم حیرت سے دیکھ رہے ہیں کہ آج بہت سارے ارسطوئے وقت ایسی چیزوں کا انکار کر رہے ہیں اور ان کی معقولیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ دوسرا رویہ اس لیے غلط ہے کہ:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

صحیح رہبری کے بغیر منزل مقصود تک پہنچ جانے کا خیال آخر کس بنیاد پر معقول کہا جا سکتا ہے؟ مشاہدہ، تجربہ، قیاس، استقراء، ان چیزوں کو جن عقلائے دہر نے عقل کی مکمل رہ نمائی کے لیے اختیار کیا ہے، ان کا حال وہی ہے جو شاعر نے اپنے شعر میں ظاہر کیا ہے۔ یہ چیزیں خود راہ رو ہیں، ان کو حقیقی راہ بر کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ سب فی الحقیقت عقل کے آلہ ہائے کار ہیں تو جہاں خود عقل نہیں پہنچ سکتی وہاں اس کے آلے کس طرح پہنچ جائیں گے۔ عقل ان آلوں سے

وہیں تک کام لے سکتی ہے جہاں تک خود اس کا پہنچنا ممکن ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ان تمام مسائل میں جو عقل کی دست رَس سے باہر ہوں، انسان کا تیسرا رویہ ہی صحیح ہے۔ عقل کے ایسے نازک وقت میں کسی ایسے خارجی رہ نما اور کسی ایسے خارجی نور کی ضرورت ہے جو عقل کی دنیا میں دن کا اجالا پھیلا دے۔ کسی معقول بات کو کسی محسوس مثال سے سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔

بصارت وبصیرت کی تمثیلی مشابہت

انسان کی چشم سر اور چشم عقل میں دو طرح کی مشابہتیں نمایاں ہیں۔ ایک مشابہت تو یہ ہے کہ جس طرح انسانوں کی بصارتیں قوت وضعف کے لحاظ سے متفاوت ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں، اسی طرح ان کی بصیرتیں بھی متفاوت ہوتی ہیں۔ فرض کیجیے کہ تین افراد دور سے کسی چیز کو دیکھتے ہیں۔ ان میں ایک کی نگاہ دور بیں اور تیز ہے، دوسرے کی اس سے کم اور تیسرے کی اور کم زور۔ تینوں اگرچہ عینی مشاہدہ میں برابر ہیں، لیکن ان کے درجات یقیناً مختلف ہوں گے۔ ان میں کا پہلا اس شے کو بالکل صاف دیکھتا ہے اور اس کے رنگ روپ اور نقش ونگار سے بھی واقف ہو جاتا ہے، دوسرا بھی اسے دیکھ تو رہا ہے، لیکن نہ صاف طور سے رنگ نظر آتا ہے اور نہ نقش ونگار۔ اور تیسرے کے سامنے اس شے کا محض ایک دھندلا سا خاکہ ہے اور بس۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان تینوں کے عینی مشاہدات یکساں درجہ رکھتے ہیں؟ بالکل یہی حال انسان کی بصیرت کا ہے۔ بعض کی عقل قوی، بعض کی ضعیف اور بعض کی ضعیف تر ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ایسے تین افراد کسی مسئلے پر غور وفکر کرتے ہیں۔ مطلق غور وفکر میں تینوں برابر ہوں گے، لیکن درجات اور اخذ نتائج میں تینوں یکساں نہیں ہو سکتے۔ دوسری اہم تر مشابہت یہ ہے کہ انسان کی آنکھیں اپنے اندر نورِ بصارت رکھتی ہیں اور اصلاً اسی میں دیکھنے کی صلاحیت واستعداد ہوتی ہے، لیکن یہ نور ایک خارجی نور کا محتاج ہوتا ہے۔ جب تک خارجی روشنی کی معاونت حاصل نہ ہو جائے، آنکھیں دیکھنے کا کام انجام نہیں دے سکتیں۔ ٹھیک یہی حال بعض مسائل میں عقل کا ہے کہ جہاں نہ مشاہدہ کام آتا ہے نہ تجربہ، نہ قیاس اور نہ استقراء، جب تک کوئی ایسی خارجی رہ نمائی نہ مل جائے جو خود عقل سے بھی بلند درجہ ہو اس وقت تک وہ مسئلہ صحیح طور پر حل نہیں ہوتا۔ اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایسی رہ نمائی کون سی ہو سکتی ہے جو عقل، مشاہدہ، تجربہ، قیاس،

استقراء، وجدان اور اس طرح کی تمام چیزوں سے بلند مرتبہ ہو۔ یہی وہ بنیادی سوال ہے جس کا صحیح جواب حاصل نہ کرنے کی وجہ سے انسانیت ہول ناک تاریکیوں میں دھکّے کھا رہی ہے۔

عقل سے بلند رہ نما

اب تک جو تفصیل پیش کی جا چکی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جسمِ انسانی کے اندر ایک وجود ایسا ہے جو اپنی حقیقت، خصوصیات اور افعال ہر لحاظ سے جسم سے علیٰحدہ ہے اور یہ انسان کا روحانی و اخلاقی وجود ہے۔ یہ بھی واضح ہو چکا کہ انسان کے پاس علم حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں ان میں سب سے اہم اور اعلیٰ ذریعہ عقل ہے، لیکن بہت سارے مسائل ایسے بھی ہیں جہاں عقل سپر رکھ دیتی ہے اور وہاں تک پہنچنا اس کی دست رس سے باہر ہوتا ہے۔ جس طرح آنکھوں کی بصارت خارجی نور کی محتاج ہے اسی طرح عقل کی بصیرت بھی کسی خارجی رہ نمائی کی ضرورت مند ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خارجی رہ نمائی عقل سے بلند درجہ ہوگی، کیوں کہ عقل کے برابر یا عقل سے فروتر رہ نمائی اس کے لیے بے کار ہوگی۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جس وجود کی طرف سے عقل کو یہ رہ نمائی ملے گی اسے خود انسان سے بلند درجہ و بلند مرتبہ ہونا چاہیے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا، انسان جب اپنے آپ پر غور کرتا ہے، اپنے نفس کی گہرائیوں میں ڈوب کر اپنا جائزہ لیتا ہے تو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں اور اپنے دماغ و دل کی پیچیدہ ترین اور عجیب ترین مشینری سے خود حیران ہوتا ہے اور اس عرفانِ نفس کے بعد کائنات پر نگاہ ڈالتا ہے تو کوئی مخلوق اسے اپنے سے بلند اور اعلیٰ نظر نہیں آتی، اس لیے وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ خود اس سے اگر کوئی ذات بلند و بالا ہو سکتی ہے تو وہی ہے جس نے دماغ و دل کی حیرت انگیز کارگاہ بنائی اور وہی ہے جس نے اسے عقل و فہم، نطق و گویائی اور ارادہ و اختیار دے کر تمام کائنات سے ممتاز کر دیا۔ یہاں تک تو خود اس کی عقل اسے پہنچا دیتی ہے، لیکن اس سے آگے بڑھنا اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اس تمام کائنات کا خالق و مالک اللہ کیسا ہے؟ اس کی ذات کیا ہے اور اس کی صفات کیا ہیں؟ اس نے انسان کو کس طرح پیدا کیا اور کیوں پیدا کیا؟ انسان سے اس کا مطالبہ کیا ہے؟ انسان کی اس دنیا میں حیثیت کیا ہے؟ یہ دنیا ہمیشہ سے اسی طرح قائم ہے یا پہلے کچھ نہ تھا اور پھر سب کچھ ہو گیا؟ یہ دنیا ہمیشہ اسی طرح قائم رہے گی یا فنا ہو جائے گی اور اگر فنا کر دی جائے گی؟ تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ اور اس طرح کے بیسیوں مسائل ہیں جن کا صحیح جواب عقل بطورِ خود نہیں دے سکتی اور یہی وہ مسائل ہیں جہاں

انسان کو سب سے بلند و بالا ہستی کی طرف سے عقل سے بھی بلند تر رہ نمائی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بلند تر رہ نمائی کیا ہے؟

وحی الٰہی

اللہ نے انسان کو عقل دی ہے اور اسی کو سب سے زیادہ اس بات کا علم ہے کہ عقل انسانی کی پرواز کہاں تک ہے؟ اس کی یہ عین مہربانی ہے کہ زندگی کے پیچیدہ ترین مسائل میں اس نے اپنی وحی کے ذریعے عقل کی رہ نمائی کی، خود انسانوں ہی کے گروہ سے اپنے انبیاء منتخب کیے اور ان کے واسطے سے اپنی ہدایت تمام انسانوں تک پہنچائی۔ دنیا کا کوئی سائنس داں یا کوئی فلسفی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے وحی کا آنا اور لاینحل مسائل زندگی میں عقل کی رہ نمائی کرنا خلاف عقل ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس رہ نمائی کا انکار خلافِ عقل ہے نہ کہ اقرار۔ میں نے پہلے یہ لکھا ہے کہ دنیا کے فلسفیوں اور سائنس دانوں کی اکثریت خدا کے وجود کی قائل و معترف ہے، لیکن ان کا یہ اقرار و اعتراف زندگی کے بناؤ اور سدھار میں کوئی فائدہ نہیں پہنچا رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ خدا کے تو قائل ہیں، لیکن اس کی بھیجی ہوئی وحی اور انسانی زندگی کے لیے اس کے دیے ہوئے قانون کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے اس انکار پر ایک معقول انسان کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ اس کائنات کو ایک ایسے خالق نے پیدا کیا ہے جو حکیم بھی ہے اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بہت سارے مسائل ایسے ہیں جن پر عقلِ انسانی قطعیت کے ساتھ حکم نہیں لگا سکتی، اس لیے کہ وہ اس کی دست رس سے باہر ہیں، لیکن ان دونوں کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ خدا کی ہدایت اور اس کی وحی کا انکار کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تیسری بات، جو ان دو باتوں کا فطری و منطقی نتیجہ ہے، اس سے انکار کی کون سی معقول بنیاد موجود ہے۔ مذہب کے خلاف بے جا تعصب اور عناد ہی اس کی بنیاد بن سکتا ہے، ورنہ کوئی عقلی بنیاد تو پائی نہیں جاتی اور لطف یہ ہے کہ وحی کے انکار کو معقول اور اس کے اقرار کو وہ غیر معقول قرار دیتے ہیں۔ اب اسے فریبِ عقل نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ عقلیت کا یہ فریب کچھ اسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ بہت عرصہ پہلے سے لوگ اس فریب میں مبتلا ہوتے رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کا جواب دیتے ہوئے امام غزالیؒ نے یہ کتنی عمدہ بات لکھی ہے:

و ظن من یظن ان العلوم العقلیة مناقضة للعلوم الشرعیة و ان

الجمع بينهما غير ممكن، هو ظن صادر عن عمى في عين البصيرة، نعوذ باللّٰه منه، بل هذا القائل ربما يناقض عنده بعض العلوم الشرعية فيعجز عن الجمع بينهما، فيظن انه تناقض في الدين فتحير به، فينسلّ من الدين انسلال الشعرة من العجين، و انما ذٰلک لِاَن عجزه في نفسه خيّل اِليه نقضًا في الدين و هيهَات، و انما مثاله مثال الاعمٰى الذى دخل دار قوم فتعثر فيها بأوانى الدار، فقال لهم: ما بال هذه الاوانى تركت على الطريق لم لاَ تردّ الى مواضعها، فقالوا له تلک الاوانى في مواضعها و انما لست تهتدى للطريق لعمالک، فالعجب منک انک لاَ تحيل عثرتک علٰى عماک و انما تحيلها على تقصير غيرک[1]

''کسی شخص کا یہ گمان کرنا کہ عقلی علوم، علوم شرعی کے منافی و متناقض ہیں اوران دونوں کا یکجا ہونا ممکن نہیں ہے، ایک ایسا گمان ہے جو چشم بصیرت کے اندھا پن سے پیدا ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات ایسے شخص کو علوم شرعی کے بعض اجزا بعض دوسرے اجزا کی ضد نظر آتے ہیں۔ وہ ان کے درمیان تطبیق پیدا کرنے سے عاجز ہوتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ یہ دین میں تناقض ہے، وہ سرگشتہ و حیران ہو کر دین سے اس طرح نکل جاتا ہے، جس طرح گوندھے ہوئے آٹے سے بال۔ وہ اپنے عجز وجہل کو دین میں تضاد و تناقض سمجھ بیٹھتا ہے، حالاں کہ دین کو تضاد سے کیا واسطہ۔ اس کی مثال اس اندھے کی ہے جو کسی گروہ کے گھر میں داخل ہو جائے، وہاں رکھے ہوئے برتنوں سے ٹکرا کر گر پڑے اور پھر یوں کہے کہ یہ برتن راستے پر کیوں چھوڑ دیے گئے ہیں، لوگ ان کو ان کی جگہ پر کیوں نہیں رکھتے۔ اس کے جواب میں گھر والے کہیں کہ یہ برتن تو اپنی جگہ پر ہیں، تو ہی اپنے اندھے پن کی وجہ سے راستہ نہیں دیکھتا۔ حیرت ہے کہ تو اپنی لغزش کو اپنے اندھے پن پر محمول نہیں کرتا، بلکہ دوسروں کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔''

امام غزالیؒ نے یہ جو اندھے کی مثال دی ہے وہ منکرین وحی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ اِس زمانے میں بھی بہت سارے مدعیان عقل وفہم اسی طرح کی کور عقلی میں مبتلا ہیں۔ وحیِ الٰہی کا آفتاب ان کی عقل کی آنکھوں کے سامنے درخشاں ہے، لیکن صرف یہی نہیں کہ وہ اس سے فائدہ

(۱) احیاء علوم الدین: ۳/ ۱۵

نہیں اٹھاتے، بلکہ زبردستی عقل کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اس آفتاب کا انکار کر رہے ہیں۔ وحیِ الٰہی اس وقت میرا موضوع تحریر نہیں ہے اس لیے اس سلسلے کی دیگر تفصیلات پیش کرنے کا موقع نہیں۔ مقصود صرف اتنا بتانا تھا کہ عناد اور تعصب کا رویہ ترک کر دیا جائے تو عقلِ انسانی، وحیِ الٰہی کی رہ نمائی قبول کرنے سے انکار نہ کرے۔

آخر ان آیتوں کے انکار کی کون سی معقول وجہ ہو سکتی ہے؟

قُلْ أَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ط قُلِ اللّٰهُ شَهِيْدٌ بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ وَ اُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْ بَلَغَ ط (الانعام:۱۹)

''ان سے پوچھو، کس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے۔ کہو، میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے۔ اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے، تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے، سب کو تنبیہ کر دوں۔''

وَ اِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ (الشعراء:۱۹۲-۱۹۵)

''اور یہ قرآن پروردگار عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ امانت دار معتبر فرشتہ اس کو واضح، بلیغ عربی زبان میں لے کر تمہارے قلب پر اترا ہے، تاکہ تم لوگوں کو خدا کا ڈراوا سناؤ۔''

قرآن چودہ سو سال سے تمام بنی نوعِ انسان کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں خدا کی بھیجی ہوئی وحی ہوں، میں تمہاری پوری زندگی کا دستور ہوں، پیچیدہ ترین اور مشکل ترین مسائلِ حیات کا اطمینان بخش حل ہوں، میری رہ نمائی قبول کرو، لیکن مدعیانِ عقل اپنی عقلی تہی مائگی کا اعتراف کرتے ہوئے بھی اس آواز کی طرف کان نہیں لگا رہے ہیں۔ عقل چاہتی ہے کہ یہ رہ نمائی قبول کر لی جائے، لیکن دین و مذہب سے عناد و تعصب اور نفسِ بہیمی کے پرزور داعیات گوشِ عقل کا بوجھ اور چشمِ عقل کا پردہ بن جاتے ہیں۔

☆☆

باب دوم

غیر الٰہی فلسفۂ اخلاق

کرۂ ارض پر جب سے انسان موجود ہے اور جب سے اس کے ذہنی، فکری اور جسمانی اعمال موجود ہیں، اخلاق بھی موجود ہے، اس لیے کہ اخلاق کا تعلق انسانی اعمال ہی سے ہے۔ جب تک انسان خدا کی ہدایت پر عمل کرتا رہا اس کا اخلاقی وجود اس کے حیوانی وجود پر غالب رہا، اس کے سامنے زندگی کی سیدھی، صاف اور روشن شاہ راہ کھلی رہی اور وہ اس پر چل کر امن وسکون کے ساتھ اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں رہا، لیکن جب اس نے وہ ہدایت بھلا دی، اس کی زندگی کی راہ ٹیڑھی میڑھی ہوگئی، امن وسکون ختم ہوا، حیرانی وسرگشتگی چھانے لگی اور وہ یہ بھی فراموش کر گیا کہ اسے جانا کہاں ہے اور اس کی منزل مقصود کیا ہے؟ اب وہ صرف اپنے وجدان، جذبات، داعیات، مشاہدات اور عقل کا بندہ تھا۔ جدھر انھوں نے رہ نمائی کی، سرپٹ دوڑنے لگا۔ اس کا حیوانی وجود اس کے اخلاقی وجود پر غالب آ گیا اور وہ انسانیت کے مقام بلند سے حیوانیت کے پست ترین غار میں جا گرا۔

تاریخ کا جو ریکارڈ موجود ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ محض عقل وجذبات کی بنیاد پر سب سے پہلے یونانیوں نے فلسفۂ اخلاق مرتب کیا۔ وہاں کے فلاسفہ نے حسبِ ذیل سوالات پر بحث و تحقیق اور تنقید وتفتیش کا دروازہ کھولا۔

انسانی اعمال کی حقیقت کیا ہے؟ ان کے اصول وقوانین کیا ہیں؟ ان کے اسباب وعلل کیا ہیں؟ ان کی غرض وغایت کیا ہے؟ اس وقت سے لے کر آج تک فلاسفۂ اخلاق ان سوالات پر بحث کر رہے ہیں، لیکن ان سوالات کا متعین اور یقینی جواب حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ ان تمام متضاد فلسفوں کے خار دار جنگل میں داخل ہو کر ان کی تفصیلات پیش کرنا یہاں میرا مقصود نہیں، لیکن

بطور نمونہ از خروارے ایک مختصر جائزہ ضرور لینا چاہتا ہوں، تاکہ یہ معلوم ہو کہ محض عقل وجذبات کی بنیاد پر مرتب کیے ہوئے فلسفے انسانی اخلاق کی گتھی سلجھانے سے قاصر رہے ہیں اور ہمیشہ قاصر رہیں گے۔

اس سلسلے میں یونانیوں کے فلسفۂ اخلاق کا جائزہ لینا میں کافی سمجھتا ہوں، کیوں کہ اس زمانے کے فلاسفۂ اخلاق نے اس پر کوئی بنیادی اور اہم اضافہ نہیں کیا ہے۔ اگرچہ اب نفسیات کو بھی اس فلسفے میں داخل کر لیا گیا ہے، لیکن اس کے نتیجہ پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوا، بات جہاں تھی وہیں رہی، فلسفۂ اخلاق کا کوئی ایک سوال بھی حل نہ ہو سکا، بلکہ ان سوالات کے جو جواب دیے گئے ان میں تضاد اور تناقض کچھ اور بڑھ ہی گیا، کم نہ ہوا۔

سقراط سے پہلے

اگرچہ مرتبین فلسفۂ اخلاق کی فہرست میں سقراط کا نام سب سے پہلا ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس سے پہلے اخلاقی خیالات بالکل معدوم تھے۔ کوئی فلسفہ اور کوئی فن اچانک مرتب شکل میں سامنے نہیں آتا، ساتویں اور چھٹی صدی قبل مسیح کی شاعری میں ہمیں ایسے سادہ اور غیر مربوط حکیمانہ اقوال ملتے ہیں، جن کی بنیاد انسانی کردار کی اخلاقیات پر رکھی گئی تھی، ان میں اخلاقی غور وفکر کی نمایاں جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔ سقراط سے پہلے ہمیں تین فلسفی ایسے ملتے ہیں جن کی اخلاقی تعلیمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا: فیثا غورث، ہرقلیطوس اور دیما قریطوس۔

فیثا غورث کا عہد ۵۰۰ ق م میں ختم ہوتا ہے۔ سقراط سے پہلے کے فلاسفہ مابعد الطبیعی مسائل میں اُلجھے ہوئے تھے۔ فیثا غورث کی بھی اصل توجہ اسی طرح تھی، لیکن ضمناً اس نے انسانی اخلاق کے بارے میں بھی خیالات پیش کیے ہیں۔ اس فلسفی کے بارے میں تفصیل سے کوئی بات معلوم نہیں، کیوں کہ اس کی تاریخ پر افسانے کا پردہ پڑا ہوا ہے، لیکن وثوق کے ساتھ اتنا معلوم ہے کہ اس نے ایک ایسی تنظیم کی بنا ڈالی تھی، جس کے اصول وقوانین میں اخلاق کو بھی خاص اہمیت حاصل تھی۔ شجاعت، دوستوں کے ساتھ خلوص، اعتدال، قانون اور حکومت کی فرماں برداری اور روزانہ احتساب نفس کی تاکید اور اس طرح کی دوسری اخلاقیات اس کی تعلیم کا اہم عنصر ہیں۔ اگرچہ اس تعلیم کا رنگ فلسفیانہ نہیں، ناصحانہ ہے۔ اس کے اخلاقی نصائح میں صرف ایک چیز ایسی ملتی ہے۔ جسے فلسفیانہ عنصر قرار دیا جا سکتا ہے، جسے اس نے اپنے مابعد الطبیعی فلسفے سے لے کر

یہاں داخل کر دیا ہے۔ اس کا وہ فلسفیانہ عنصر کائنات کا ریاضیاتی نقطۂ نظر ہے۔ جس طرح وہ اجزائے کائنات میں یکسانیت اور توازن کا سبب اکائی کو سمجھتا ہے اسی طرح اخلاق میں توازن پیدا کرنے کے لیے اعداد ہی سے مدد لیتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ فضیلت وصحت توازن کا نام ہے اور دوستی توازنی مساوات ہے۔ یہ توازن ایک یا چند اعداد مل کر پیدا کرتے ہیں۔

ہرقلیطوس کا عہد ۴۷۰ ق م میں تمام ہوتا ہے۔ اس کے یہاں بھی اخلاق کے متعلق وہ باتیں ملتی ہیں جن سے بعد کے فلسفیوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔ مثلاً وہ لوگوں کو اس عقل کی راہ پر مضبوطی سے قائم رہنے کی تلقین کرتا ہے جو سب انسانوں کے اندر مشترک ہے۔ اسی کو وہ دوسرے الفاظ میں یوں ادا کرتا ہے کہ ''حکمت اس میں ہے کہ انسان فہم وفطرت کے مطابق عمل کرے۔''

ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے اور دوسری طرف اس کا خیال ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے وہ سب مبنی بر عدل ہے اور اس میں جو ظلم ہمیں نظر آتا ہے وہ محض فہم انسانی کی نسبت سے ہے۔ یعنی انسان اسے ظلم سمجھتا ہے، حالاں کہ حقیقت کے لحاظ سے وہ ظلم نہیں، بلکہ عدل ہے۔ ہرقلیطوس نے یہ احمقانہ بات شاید مظلوموں کی تسلی کے لیے کہی ہوگی، لیکن اس نے اتنا نہ سمجھا کہ زور آوروں کو ظالمانہ کارروائیوں کے لیے وہ ایک دلیل فراہم کر رہا ہے۔

دیماقریطوس کا عہد ۳۰۰ ق م میں ختم ہوتا ہے۔ اس کے جو خیالات ہم تک پہنچے ہیں ان میں بھی چند غیر مربوط اور متضاد باتیں اخلاق سے متعلق ملتی ہیں۔ یہ شاید سب سے پہلا فلسفی ہے، جس نے صاف الفاظ میں یہ دعویٰ کیا کہ انسان کے لیے سب سے برتر اور اصلی خیر لذت اور خوشی کا حصول ہے۔ اگرچہ وہ خود روحانی لذتوں کو خیالی لذتوں پر ترجیح دیتا تھا، لیکن فی الواقع اس کا یہ فلسفۂ اخلاق بے قیدی کے لیے ایک بنیاد فراہم کر رہا تھا۔ ایک طرف تو وہ یہ کہتا ہے کہ برائی کرنا ہی بدی نہیں ہے، بلکہ برائی کی خواہش بھی بدی ہے اور دوسری طرف یہ کہتا ہے کہ ظلم کا شکار ہونا ظلم کرنے سے بھی بدتر ہے، یعنی مظلوم ہونا ظالم ہونے سے زیادہ برا ہے۔

ان تین فلسفیوں کے علاوہ فلاسفہ کی ایک اور جماعت 'سوفسطائیہ' سقراط سے پہلے گزری ہے، لیکن یہ لوگ انسانی کردار کی جو تعلیم دیتے تھے وہ اس قدر عامیانہ تھی کہ اس کو فلسفیانہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ چوں کہ یہ لوگ سقراط سے کچھ پہلے گزرے ہیں اس لیے اِس بے باک نکتہ چیں کی تنقیدوں کا خوب خوب ہدف بنے اور اس کی کسوٹی پر بالکل کھوٹے ثابت ہوئے ہیں۔ اس

جماعت کی تعلیم کو اگر الفاظ کا گورکھ دھندا کہا جائے تو بے جا نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قدیم اوہام پرستی کو کم کرنے میں ان کی کوشش قابلِ ستائش ہے، لیکن جن اخلاقیات کی یہ تعلیم دیتے تھے ان کے صحیح مفہوم سے خود ناآشنا تھے، اس لیے تحقیق پسند لوگ اسے الفاظ کی بازی گری سمجھنے لگتے تھے اور انہیں دھوکہ باز کہتے تھے۔ ہنری ہوک سابق پروفیسر اخلاقیات جامعہ کیمبرج ان لوگوں کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ لوگ ایسا کرنے میں دیدہ ودانستہ دھوکہ بازی سے کام لیتے تھے، کیوں کہ ان کی حالت بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ سیاسی مشیر کی حیثیت سے ہمارے اخبار نویسوں کی ہے۔ظاہر ہے کہ اخبار نویس سیاست داں ہونے کے اعتبار سے جو کچھ قدر ومنزلت رکھتے ہیں وہ کسی خاص سیاسی فراست وحکمت پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ زود نویسی اور مضمون نگاری کا طفیل ہوتی ہے۔''(۱)

سقراط

۴۷۰ تا ۳۹۹ ق م سقراط کا عہد ہے۔ یہ فلاسفۂ یونان میں سب سے پہلا شخص ہے جس کو انسانی کردار کی تحقیق سے انتہائی دلچسپی تھی۔ وہ ان طبیعی اور مابعد الطبیعی تحقیقات سے سخت متنفر تھا جن میں اس کے معاصر اور متقدم فلاسفہ الجھے ہوئے تھے۔ اس تنفر کی دو وجہیں تھیں: ایک تو یہ کہ وہ ان کے نظریات کے نتائج سے مطمئن نہ تھا۔ اور دوسری یہ کہ اس کے نزدیک کائنات طبیعی کے راز کا انکشاف انسانی امکان سے باہر تھا۔ وہ فلاسفہ کے متناقض اور متصادم نظریات کے بارے میں اپنا یہ تاثر ظاہر کرتا ہے: ''ان کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے چند دیوانے آپس میں بحث ومباحثہ کر رہے ہوں۔'' کائنات طبیعی کے انکشاف راز اور مابعد الطبیعی مسائل کی تحقیق میں فلاسفہ کے بحث ومباحثہ کی یہ تشبیہ فی الواقع وہی شخص استعمال کرسکتا ہے جس نے ان بحثوں کے مطالعہ میں اپنا کچھ وقت صرف کیا ہو۔ سقراط کی عقل اس مقام تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے تخلیق کائنات کے انکشافِ راز کو انسان کے امکان سے باہر قرار دیا اور وہ یہ حقیقت بھی پا گیا تھا کہ انسان کو اپنے کردار کے متعلق تحقیق وتفتیش کرنی چاہیے اور اپنے اخلاق کو درست کرنے کی فکر کرنی چاہیے، لیکن افسوس کہ اسے حقیقی علم کی رہ نمائی نہ مل سکی۔ اس نے طبیعی اور مابعد الطبیعی مسائل کی تحقیق سے رخ

---

(۱) تاریخ اخلاقیات، ترجمہ احسان احمد صاحب بی-اے

موثر کر انسانی کردار کی تحقیق کرنی چاہی اور اپنی عقل کو اس مسئلے کے حل پر مرکوز کر دیا، لیکن اصلاً چوں کہ اس مسئلے کا تعلق بھی مابعد الطبیعی مسئلے کے ساتھ جڑ جاتا ہے، اس لیے اس کی عقل کوئی صحیح حل دریافت نہ کر سکی۔ اس کے فلسفۂ اخلاق کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے اس کو پڑھنے سے صاف طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے ماحول اور اس میں پھیلے ہوئے اخلاقی خیالات و معتقدات پر صرف کڑی تنقیدیں کی ہیں اور اس کی ساری بحث و جرح نے صرف یہ کام کیا کہ لوگوں کے معتقدات متزلزل کر دیے، لیکن وہ ان کے سامنے کوئی واضح ایجابی شے نہ رکھ سکا۔ اس کے فلسفۂ اخلاق کا سلبی پہلو اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ ایجابی پہلو نہ صرف یہ کہ دب گیا ہے، بلکہ مبہم اور گنجلک ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اس کے اپنے شاگردوں نے اخلاق کے سلسلے میں بالکل متضاد نظریے اختیار کر لیے۔ اس کا ایک شاگرد 'بھلائی اور خیر' کو صرف لذت میں منحصر سمجھتا ہے، عام ازیں کہ یہ لذت جسمانی ہو یا ذہنی۔ اور اس کا دوسرا شاگرد اس کے بالکل برعکس لذت کو شرِ محض سمجھتا ہے اور افلاس، محنت و تعب اور بدنامی و رسوائی کو خیر اور وسیلۂ خیر قرار دیتا ہے۔ نظریات کا تناقض، تضاد اور تصادم یہاں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح فلسفۂ الٰہیات میں موجود تھا۔ کاش سقراط اس حقیقت کو بھی پا لیتا کہ اخلاق انسانی کا مسئلہ بھی تنہا عقل کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس کی عقل نے اتنی رہ بری کی کہ تمام بداخلاقیاں جہل و نادانی کی وجہ سے صادر ہوتی ہیں، اگر انسان کو اس کا علم حاصل ہو جائے کہ اس کے لیے خیر اور بھلائی کس چیز میں ہے تو وہ برے کام نہ کرے۔ وہ علم کو انسان کے لیے سب سے برتر خیر قرار دیتا ہے اور پھر خیر کے علم کو سب سے اہم علم قرار دیتا ہے، لیکن نہ وہ اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ اس علم کا ماخذ کیا ہے اور کون ہے اور نہ وہ خیر کی تعریف و تشریح کرتا ہے، بلکہ جب لوگ اس کے بارے میں اس سے سوال کرتے تھے تو جواب سے گریز کر جاتا تھا، حالاں کہ ایک بنیادی سوال یہی ہے کہ کسی اختیاری فعل کو خیر یا شر کہنے کا معیار اور اس کا پیمانہ کیا ہے؟ اور وہ انتہائی اور اعلیٰ ترین خیر کیا ہے جس کی طلب انسان کو کرنی چاہیے؟ کسی فلسفی کا فلسفہ اس کا تشفی بخش جواب نہیں دیتا۔ نیز سقراط کی یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ "خیر و شر کا محض علم اس کے اختیار کرنے یا اس سے بچنے کے لیے کافی ہے۔"

سقراط کے بعد

سقراط نے فلسفۂ اخلاق کا جو بیج ڈالا تھا، افلاطون اس کا شگوفہ اور ارسطو اس کا پھل ہے۔ یہ دونوں فلسفی جس طرح طبعیات و مابعد الطبیعیات کے فلسفے میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اسی طرح فلسفۂ اخلاق میں بھی سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ سقراط نے جس فلسفہ کی ابتدا کی تھی، افلاطون اور ارسطو نے اسے ایک مرتب اور وسیع فن بنا دیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ جیسا تخم ہوگا ویسے ہی پھل اور پھول بھی ہوں گے، جیسی اصل ہوگی ویسی ہی اس کی شاخیں بھی ہوں گی۔ ہم جب مکالماتِ افلاطون اور اخلاقیاتِ ارسطو کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہاں بھی خیر وشر کے متعلق کوئی متحدہ خیال نہیں ملتا، بلکہ تناقض وتضاد یہاں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ سارے فلسفی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انسان کا کمال یہ ہے کہ وہ خیر کو اختیار کرے اور شر کو ترک کرے، لیکن ان میں کا کوئی بھی خیر وشر کی حقیقت تک نہ پہنچ سکا، اس لیے کہ ان سب نے صرف عقل و وجدان کی رہ نمائی پر اعتماد کیا اور انہیں عقل و وجدان سے بلند و برتر رہ نمائی نہ مل سکی۔ افلاطون اور ارسطو کے فلسفوں میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مسائلِ اخلاق کا رشتہ بھی فی الواقع مابعد الطبیعی مسائل کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اس لیے جب تک ان مسائل کا کوئی متعین جواب نہ مل جائے مسائل اخلاق بھی صحیح طور پر حل نہیں ہو سکتے۔ ان بہت سے مقامات میں، جہاں عقل سپر انداز ہو جاتی ہے، یہ ایک اہم مقام ہے۔ یہ تینوں فلسفی اصل خیر انسان کی سعادت کو قرار دیتے ہیں، لیکن یہ سعادت حاصل کس طرح ہو سکتی ہے؟ یہاں پہنچ کر ان کی گاڑی رک جاتی ہے اور یہیں سے متعدد و مختلف راستے، متضاد سمتوں میں جا نکلتے ہیں۔ نہ یہ طے پاتا ہے کہ انسانی اعمال کی حقیقت کیا ہے؟ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعین اصول وقوانین کیا ہیں؟ متعین اسباب وعلل کیا ہیں؟ اور نہ تشفی بخش طریقے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ انسانی اعمال کی غرض وغایت کیا ہے؟ اور یقین کے ساتھ ہم کس طرح اس غایت کو حاصل کر سکتے ہیں؟ ان سوالات میں سے ہر سوال کے متعلق بیسیوں نظریے پیش کیے جاتے ہیں اور اکثر وبیشتر ہر نظریہ دوسرے کی تردید کرتا ہے۔ غرض ایک دوسرے کی تردید کا لامتناہی سلسلہ ہے، جو کہیں ختم نہیں ہوتا۔ یہ بات نہیں ہے کہ سقراط، افلاطون اور ارسطو، خدا کے منکر ہوں، ان میں سے ہر ایک خدا کا اقرار کرتا ہے۔ سقراط کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ وہ خدائے واحد کا قائل تھا۔ وہ

کہتا تھا کہ انسان سے اعلیٰ تر فوق الفطرت ہستیوں کا وجود ہے، لیکن اصل الوہیت ایک خدائے واحد کو حاصل ہے، جو خیر مطلق، علم مطلق، سراپا عقل وعدل اور رب العالمین ہے، لیکن ان فلسفیوں کو چوں کہ وحی الٰہی کی رہ نمائی حاصل نہ ہوسکی، اس لیے نہ تو یہ خدا کی صفات سے پوری طرح واقف ہوسکے اور نہ انھیں زندگی کے بعد کسی یوم الحساب کا یقین آسکا۔ بلکہ یہ قِدم عالم کے قائل ہوگئے اور ارسطو تک پہنچتے پہنچتے تو خدا ایک واجب الوجود علت العلل کی حیثیت سے باقی رہ گیا اور بس۔ خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہوکر انھوں نے جو نکتہ آفرینیاں کی ہیں ان کی حیثیت ذہنی مشق وتمرین اور فکری مجادلہ ومباحثہ کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یہ فلسفیانہ مجادلے کسی قلب میں یقین کا نور نہیں پیدا کرتے، بلکہ اگر یقین کا نور موجود ہو تو اسے شک اور تذبذب کی ظلمت سے بدل دیتے ہیں۔

مسیحیت جب یونان وروم میں داخل ہوئی تو کچھ دنوں اس نے اس فلسفے کا مقابلہ کیا، لیکن وہ خود اوہام وخرافات کا مجموعہ بن چکی تھی، اس لیے اس فلسفے کو شکست دینے کے بجائے اس نے خود اس سے شکست کھائی اور ارسطو کا فلسفہ مسیحیت کا عنصرِ ثانی بن گیا۔ خدا کی ہدایت، احبار کے من گھڑت فقہی مسائل، رہبان کے اوہام اور ارسطو کے فلسفہ سے مرکب مسیحیت کے خلاف جب یورپ میں آواز بلند ہوئی تو اس معجون مرکب مذہب کا ہر جز رد کردیا گیا اور اس پورے مجموعے کو لوگوں نے اٹھا کر پھینک دیا۔ اگر چہ لوتھر نے مسیحیت کے صرف مذہبی اجزاء کی مخالفت کی تھی، لیکن اس کی موت پر ابھی بیس سال ہی گزر رہے تھے کہ فلسفۂ ارسطو کی شامت بھی آگئی۔ نوجوانوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ کلیسائیت نے فلسفہ کو مذہب کا غلام بنا کر رواج دیا تھا۔ اس نے فلسفہ کو مذہبی طریقوں کا پابند بنا کر اس کی عقلی فعلیت کو قید وبند میں مبتلا کردیا اور اس طرح لوگ دہری قید میں ڈال دیے گئے: ایک قید کلیسا کی اور دوسری ارسطو کی، چناں چہ لوتھر کے بیس سال بعد نوجوان ریمبس نے پیرس یونیورسٹی کے سامنے کامیابی کے ساتھ یہ دعویٰ پیش کیا کہ ”ارسطو نے جو کچھ تعلیم دی ہے وہ سب غلط ہے۔“

اور اس کے چند ہی سال بعد اٹلی میں مفکرین کی یکے بعد دیگرے ایک جماعت پیدا ہوئی جس نے یہ مژدہ سنایا کہ جدید علم طبیعی کی صبح طلوع ہوچکی ہے اور پھر زیادہ دن نہیں گزر رہے تھے کہ جدید فلسفۂ اخلاق کی صبح بھی طلوع ہوگئی۔ یہ صبح اپنے ساتھ کیا لائی؟

یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے بعد

یہ صبح اپنے ساتھ خالص مادہ پرستی کا ایک ایسا نظریہ لائی، جس نے رہی سہی روحانیت کا خاتمہ کر دیا۔ اس صبح کے ساتھ نفسانیت کی ایک ایسی سیاہ آندھی اُٹھی، جس نے تمام یورپ میں مذہب و اخلاق کو خس و خاشاک کی طرح تتر بتر کر دیا۔ اس صبح کی جلو میں بداخلاقی، جنسی انارکی اور الحاد و بے دینی کا ایک مسلح لشکر تھا، جس نے انسانیت کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کیا اور اب انسان مکمل حیوان تھا۔ حیوانی حاجات و ضروریات، خواہشات و داعیات اور نفسانی میلانات و رجحانات کے سوا کوئی دوسری چیز اسے منظور نہ تھی۔ انفرادی و اجتماعی زندگی کا پورا نظام صرف مادیت اور مفاد پرستی پر استوار کیا گیا اور تمام علوم و فنون اسی نظریۂ حیات کو سامنے رکھ کر مرتب کیے گئے۔ انسانیت کے لیے یہ صبح نہ تھی، بلکہ بھیانک سیاہ رات تھی، جس کی صبح اب تک طلوع نہیں ہوئی۔ انسان کی فطرت میں چوں کہ خیر و شر، فجور و تقویٰ دونوں ہی ودیعت ہیں۔ اس لیے اس عہد تاریک میں بھی یورپ اور امریکہ کے کچھ لوگوں نے اس صورتِ حال سے اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے، لیکن اب تک وہاں کوئی ایسی کامیاب تحریک نہیں اٹھی، جو لوگوں کے سوچنے کا انداز بدلے۔ کچھ لوگوں کے محض علمی طور پر اخلاق کا وعظ کہتے رہنے سے ظاہر ہے کہ موجودہ صورت حال نہیں بدل سکتی۔ میں نے جیسا کہ پہلے لکھا ہے، میں موجودہ فلاسفۂ اخلاق کے خیالات میں نہیں اُلجھوں گا۔ انھوں نے فلسفۂ اخلاق میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ محض یہ دکھانے کے لیے کہ کچھ لوگ اپنی موجودہ مغربی تہذیب سے کس قدر نالاں ہیں، ایک مستند اخلاقی فلسفی کی چند عبارتیں یہاں پیش کر کے اس بحث کو ختم کروں گا۔ البرٹ اسکیوٹزر[1] (Albert Schweitzer) لکھتا ہے:

> ”اخلاقی خیالات، جن پر تہذیب کا انحصار ہے، دنیا کے ارد گرد اس طرح چکر لگا رہے ہیں جس طرح افلاس زدہ اور بے گھر لوگ آوارہ گشتی کیا کرتے ہیں۔ کائنات کا کوئی ایسا نظریہ اب تک ترقی نہیں کر سکا جو ان اخلاقی خیالات کو کوئی مستحکم بنیاد مہیا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں

---

(۱) البرٹ اسکیوٹزر کو اس صدی کا ایک بہت بڑا فلسفی اور معلم اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ اس کو امن کا نوبل پرائز بھی ملا تھا۔ ابھی حال میں ایک امریکن پروفیسر نے دہلی یونیورسٹی کے ایک جلسے میں اس فلسفی کا تعارف کرایا تھا۔ امریکن پروفیسر نے اس کے بارے میں یہ الفاظ بھی کہے تھے: ”اس سے جو شخص بھی ملے وہ محسوس کرتا ہے کہ ایک عظیم روح کے سامنے ہے۔“

ٹائمز آف انڈیا، ۱۸ر جنوری ۱۹۵۶ء

ایمان دارانہ عہد و پیمان کی طاقت ور اور بیدار روح دوڑنے کے بجائے بے ربط اور سطحی خیالات دنیا کو ادھر سے ادھر دھکیلے رہے رہیں اور دنیا بے کار و مضر اعمال کی آماج گاہ بنی ہوئی ہے۔ افسوس، ہم ظلمتوں کے عہد میں تاریک سفر کر رہے ہیں۔''

بلا دینی مغربی تہذیب کی یہ کتنی اچھی تصویر کشی ہے! اس مغربی فلسفی نے اپنی تہذیب کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ دنیا کی زحمت اقتصادی نہیں ہے، بلکہ اصل زحمت اخلاقی ہے۔ وہ اخلاقی نشاۃ ثانیہ کا زبردست حامی ہے۔ لکھتا ہے:

''ان تمام طاقتوں کے درمیان جو حقیقت اور اصلیت کو متشکل کرتی ہیں، اخلاق سب سے اول اور سب سے اعلیٰ ہے۔''

وہ پوری طاقت سے یہ اعلان کرتا ہے کہ موجودہ تہذیب کی پوری عمارت مسمار کر کے جب تک اسے مذہبی اخلاقی بنیادوں پر استوار نہ کیا جائے، دنیا کا بحران ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ لکھتا ہے:

''موجودہ بحران میں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ کس کی تہذیب باقی رکھی جائے اور کس کی مٹا دی جائے، بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک نئی تہذیب از سر نو برپا کی جائے۔''(۱)

آزاد عقل اور کھلی ہوئی آنکھوں سے اس فلسفی کو بھی اس حد تک پہنچا دیا جہاں تک عقل پہنچا سکتی ہے، لیکن اس کے آگے جس رہ نمائی کی ضرورت ہے، افسوس کہ یہ فلاسفہ اسے قبول نہیں کرتے اور عقل سے آگے کی منزل کو بھی عقل ہی کی رہ نمائی میں طے کرنا چاہتے ہیں، جس کا نتیجہ صفر نکلتا ہے۔ فلاسفہ کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے، اس کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو خدا کے منکر ہوں، لیکن ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو خدا کی بھیجی ہوئی وحی اور اس کے اتارے ہوئے قانون کا منکر نہ ہو۔ کاش یہ فلاسفہ اس کھلی ہوئی حماقت سے باز آجاتے۔ کاش ان کی سمجھ میں یہ بات آجاتی کہ خدا، جس نے یہ کائنات بنائی ہے، اس نے انسانوں کے لیے ایک قانون بھی اتارا ہے۔ کاش یہ لوگ قرآن کے فلسفۂ اخلاق اور اس کے فلسفۂ زندگی پر دھیان دیتے۔ البرٹ اور اس جیسے دوسرے لوگ، جو اخلاق کی نشاۃ ثانیہ کے حامی ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ صرف اور صرف قرآن کے فلسفۂ اخلاق سے حاصل کی جا سکتی ہے اور اسی کی بنیاد پر ایک ایسی نئی تہذیب جنم لے سکتی ہے جو انسانیت کا بہترین و بلند ترین آئیڈیل ہے۔

(۱) البرٹ کے حوالے 'وائس آف اسلام' کراچی سے لیے گئے ہیں۔

باب سوم

قرآن کا فلسفۂ اخلاق

غیر الٰہی فلسفۂ اخلاق کی مختصر تشریح کرتے ہوئے یہ لکھا گیا تھا کہ یونان کے فلاسفۂ اخلاق ہوں یا یورپ و امریکہ کے حکماء اخلاق، ان سب کی اصل محرومی یہ ہے کہ جہاں عقل کا گزر ممکن نہیں وہاں بھی یہ لوگ اپنے قیاس و استقراء کے تیر تکے لگانے سے باز نہیں آتے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اخلاق کا مسئلہ ایک لا حاصل بحث بن جاتا ہے اور کوئی ایک بنیادی سوال بھی حل نہیں ہوتا۔ تاریخ انسانی کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی اخلاق کا مسئلہ وحیِ الٰہی کی رہ نمائی کے بغیر کبھی حل نہیں ہوا، اور آج ہم جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس کا مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ انسان کی کوئی کوشش اس مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی ہے۔ یہ دنیا ایک طرف زیادہ مادی ترقی حاصل کرتی جا رہی ہے، دوسری طرف اسی قدر اخلاقی انحطاط کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ مادّی ترقی اور اخلاقی تنزل، جسمانی ارتقاء اور روحانی انحطاط، اس ایٹمی دور کی خاص علامت بن گئی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا، یورپ و امریکہ کے فلسفیوں کو اخلاقی زوال کا احساس تو پیدا ہوا ہے، لیکن اخلاقی نشاۃ ثانیہ کے لیے وحیِ الٰہی کی جس رہ نمائی کی ضرورت ہے وہاں تک ابھی وہ نہیں پہنچ سکے ہیں۔ قرآن ہی کے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد پر ایک ایسی نئی تہذیب جنم لے سکتی ہے جو انسانیت کا بہترین و بلند ترین آئیڈیل ہے، لیکن دنیا کے سربراہ کار اگر اس چشمۂ حیواں سے ناواقف ہیں یا وہ ادھر متوجہ نہیں ہوتے تو اس ناواقفیت یا عدم توجہ کا بڑا سبب خود وہ لوگ ہیں جو اس کے امین ہیں، اس پر ایمان کا دعویٰ رکھتے اور الفاظ کی حد تک اسی کو واحد حل تسلیم کرتے ہیں۔ اگر قرآن کے ماننے والے دنیا کے کسی چھوٹے سے چھوٹے خطے میں بھی اس تہذیب کا ایک مکمل نمونہ دکھا دیتے جو قرآن کے فلسفۂ اخلاق سے پیدا ہوتی ہے تو دنیا کو یقین آ جاتا کہ واقعی یہی

ہمارے اخلاقی امراض کا علاج اور ہماری روحانی بیماریوں کا مداوا ہے، اسی کی بنیاد پر ہم ایک متوازن اور پاکیزہ معاشرہ تعمیر کر سکتے اور اخلاقی بحران سے نجات پا سکتے ہیں۔ اگرچہ کوئی ذہین آدمی نظری طور پر بھی قرآن کے فلسفۂ اخلاق کو سمجھ لے تو اسے یہ ماننے میں کوئی تامل نہ ہو کہ یہی اصولِ اخلاق اس مسئلے کا حقیقی اور واقعی حل ہیں، آیئے یہ دیکھیں کہ قرآن کس طرح اس مسئلے (Problem) کو حل کرتا ہے۔

فلسفۂ اخلاق کا ابتدائی سرا

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن اس مسئلے کی ابتدا کہاں سے کرتا ہے؟ اور اس کے نزدیک اس کا ابتدائی سرا کیا ہے؟ کوئی گتھی اس وقت تک صحیح طریقے سے سلجھ نہیں سکتی جب تک اس کا ابتدائی سرا ہمارے ہاتھوں میں نہ آ جائے۔ صرف عقل کی مدد سے اس مسئلے کو حل کرنے والے فلاسفہ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ درمیان سے اس گتھی کو سلجھانے کی سعی شروع کر دیتے ہیں۔ اصلاً یہ مسئلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے اس کی یا تو انہیں پروا نہیں ہوتی یا وہ وہاں تک پہنچ نہیں سکتے۔ اس مسئلہ کا ابتدائی سرا اس بات کا علم ہے کہ انسان کی زندگی کیا ہے؟ اس کا مقصدِ وجود کیا ہے؟ اور اس دنیا میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اسی سوال کا جواب اس گتھی کا ابتدائی سرا ہے۔ کوئی فلسفی محض عقل کی مدد سے اس سوال کو حل نہیں کر سکتا، اس لیے پورا فلسفۂ اخلاق لاینحل رہ جاتا ہے۔ وحیِ الٰہی اس سوال کا صحیح ترین جواب عطا کرتی ہے اور پھر پورا فلسفۂ اخلاق اس طرح حل ہو جاتا ہے کہ دماغ اور دل دونوں ہی مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اطمینان اس لیے حاصل ہوتا ہے کہ اس سوال کا جواب اس ہستی کی طرف سے ملتا ہے جو انسان اور تمام کائنات کی خالق ہے اور صرف خالق ہی نہیں ہے، بلکہ وہی حکمت و دانائی کے ساتھ اس کائنات کو چلا بھی رہی ہے۔ جو لوگ بھی خدا کو اس پوری کائنات کا خالق تسلیم کرتے ہیں ان کو یہ بات ماننے میں کیا تامل ہو سکتا ہے کہ اسی کو اپنی مخلوق کے متعلق سب سے زیادہ صحیح علم حاصل ہے اور اسی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ اپنی مخلوق کی حیات اور اس کا مقصدِ وجود بتائے۔ یہ بات تو موٹی سی موٹی عقل میں بھی آ جانی چاہیے کہ کسی مشنری کے بنانے والے ہی کو اس کی ساخت اور اس کے مقصد کا صحیح علم ہوتا ہے اور اسی کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ دوسروں کو اس کے بارے میں صحیح معلومات عطا کرے۔ خالقِ کائنات نے اپنی مخلوق انسان کی زندگی، اس کے مقصدِ وجود اور اس کی حیثیت کے بارے میں ہمیں یہ علم عطا کیا

ہے کہ انسان کی زندگی مستعار امانت، اس کا مقصدِ وجود اطاعت اور دنیا میں اس کی حیثیت خلافت و نیابت ہے۔ انسان دنیا میں مالک نہیں مملوک ہے، حاکم نہیں محکوم ہے، آقا نہیں غلام ہے۔ ہر شخص بادنیٰ تامل یہ سمجھ سکتا ہے کہ انسانی اخلاق کا مسئلہ طے کرنے کے لیے انسان کی حیثیت کی تعیین کس قدر ضروری ہے۔ کیوں کہ حیثیتوں کے اختلاف سے اخلاقیات میں بھی زبردست اختلاف واقع ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ کسی عمل کے نیک یا بد ہونے کے فیصلے میں فرق آ جاتا ہے۔ فرض کیجیے کہ میری جیب میں دس روپے ہیں، ان روپیوں سے متعلق میری دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں: ایک یہ کہ میں ان کا آزاد اور خود مختار مالک ہوں اور ان کے سلسلے میں مجھے کہیں کوئی جواب دہی کرنی نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ ان کا حقیقی مالک تو کوئی اور ہے اور اس نے مجھے چند شرائط کے ساتھ ان میں تصرف کا حق عطا کیا ہے اور ان کے سلسلے میں اس کے حضور مجھے پوری جواب دہی کرنی ہے۔ پہلی صورت میں میرے کسی تصرف کو برا نہیں کہا جا سکتا۔ دوسری صورت میں اگر میں مالک کی لگائی ہوئی شرائط میں سے کسی شرط کی بھی خلاف ورزی کروں تو میرے اس تصرف کو برا کہا جائے گا اور فی الواقع اسے خیانت قرار دیا جائے گا۔ یہ اتنی صاف اور واضح بات ہے کہ اس میں انکار کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اب اس اصول کو انسان کی پوری زندگی کے اعمال و افعال پر پھیلا کر دیکھیے۔ تو نیک و بد اور خوش اخلاقی و بد اخلاقی کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ انسان کی دنیوی زندگی کی حقیقت، مقصدِ وجود اور حیثیت کے متعلق یہ جو کچھ عرض کیا گیا، جگہ جگہ قرآن میں اسے واضح کیا گیا ہے، یہاں محض مختصر اشارے کیے جاتے ہیں۔

خلافت

آپ سب سے پہلے سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع میں انسان کی خلافت کا ذکر پائیں گے۔ میں چند آیتوں کا ترجمہ پیش کرتا ہوں:

> ”پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انھوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انظام کو بگاڑے گا اور خوں ریزیاں کرے گا؟ آپ کی حمد وثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر رہے ہیں۔ فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے، پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمہارا خیال صحیح

ہے (کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے انتظام بگڑ جائے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ انھوں نے عرض کیا: نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے، ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر اللہ نے آدم سے کہا: تم انھیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب اس نے ان کو سارے نام بتا دیے تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی میں جانتا ہوں۔ پھر جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ تو سب جھک گئے، مگر ابلیس نے انکار کیا۔ وہ اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں پڑ گیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔'' (آیات: ۳۰-۳۴)

ان آیتوں سے چند حقیقتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں: پہلی حقیقت تو یہی سامنے آتی ہے کہ انسان اس دنیا میں خدا کے نائب کی حیثیت رکھتا ہے اور خدا کی وسیع و عظیم سلطنت کے اس مختصر حصے ـــــ زمین ـــــ میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ یہاں کے انتظامات کی باگ اپنے ہاتھ میں لے۔ ایک طرف تو اللہ نے اپنی اس با اختیار مخلوق کو اپنی خلافت و نیابت عطا کر کے اتنا بڑا درجہ عنایت کیا ہے کہ خدا کی کوئی مخلوق اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ فرشتے تک بھی اس کے سامنے جھکا دیے گئے ہیں اور پوری کائنات اس کے لیے مسخر کر دی گئی ہے، کیوں کہ یہ خدا کا نائب اور اس کا وائسرائے ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی سمجھا دی گئی ہے کہ تم وائسرائے ہو، بادشاہ نہیں ہو، تم شہنشاہِ کائنات کے کارندے ہو، خود شہنشاہ نہیں ہو۔ دوسری حقیقت جس کا علم ہمیں حاصل ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو علم عطا کیا ہے اس کی نوعیت وہ نہیں ہے جو فرشتوں کے علم کی ہے۔ آیتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو اپنے شعبۂ کار کے جزوی علوم عطا کیے گئے ہیں اور انسان کو ان کے مقابلے میں کلّی اور جامع علم دیا گیا ہے۔ وہ جس جگہ وائسرائے بنا کر بھیجا گیا ہے وہاں کے تمام شعبوں کے متعلق اسے کچھ نہ کچھ بتایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امتحان لیا گیا تو آدم فرشتوں سے بازی لے گئے اور فرشتوں کو اپنی ناواقفیت کا اعتراف کرنا پڑا۔

یہاں ضمنی طور پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ آدم علیہ السلام کو جو علم دیا گیا تھا، فرشتوں کے سامنے اس کے مظاہرے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چوں کہ یہ حکم دینا تھا کہ آدم کے آگے جھک جاؤ، اس لیے اس نے آدم علیہ السلام کی فضیلت کا عملاً مظاہرہ کرا

دیا، تاکہ فرشتے پورے انشراح صدر کے ساتھ یہ سمجھتے ہوئے آدم کے سامنے جھکیں کہ جس کے سامنے ہم جھک رہے ہیں اس کا مبلغِ علم بھی ہم سے زیادہ ہے اور اس کا درجہ بھی ہم سے اونچا ہے۔

بعض حدیثوں میں انسانوں سے متعلق فرشتوں کی ایک اور گفتگو کا ذکر آتا ہے۔ اس سے اس کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر انسان کو فضیلت بخشی ہے۔

> "حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ نے آدم و اولادِ آدم کو پیدا کیا تو فرشتوں نے کہا: اے رب! تو نے ان کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ یہ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، نکاح کرتے ہیں اور جانوروں پر سوار ہوتے ہیں، لہٰذا ان کے لیے دنیا کو خاص کر دے اور ہمارے لیے آخرت کو خاص کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں کہا: میں نے جس کو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا، اس کا درجہ اس وجود کے برابر نہیں کروں گا جسے میں نے کہا 'ہو جا' تو وہ ہو گیا۔" (بیہقی فی شعب الایمان)

حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ فرشتوں نے انسانوں سے متعلق خدا سے یہ کہا کہ جب یہ لوگ دنیا سے فائدہ اٹھائیں گے اور ہم دنیا سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے تو ہونا یہ چاہیے کہ دنیا انسانوں کے لیے ہو اور آخرت ہمارے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور فرشتوں کی کیفیتِ تخلیق کے فرق کو اس لیے واضح کیا کہ دونوں کے درجے کا فرق خود ظاہر ہو جائے۔ "اپنے ہاتھوں سے بنانا اور روح پھونکنا"، محض تخلیق کے اہتمام اور اس مخلوق کی تشریف و تکریم کو ظاہر کرنے کے لیے فرمایا گیا۔ تخلیق کا یہ اہتمام خود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کوئی معمولی مخلوق نہیں ہے۔ اس کو جو صفات عطا کی گئی ہیں وہ صفاتِ الٰہی کا عکس ہیں اور صوری، معنوی، حسّی اور عقلی کمالات کی جو جامعیت انسان کو عطا کی گئی ہے وہ فرشتوں کو نہیں دی گئی۔ اس سے یہ بتانا مقصود تھا کہ یہ وہ وجود ہے کہ فرماں برداری کرے تو دنیا بھی اس کی اور آخرت بھی اس کی۔ یہ ساری کائنات اسی لیے بنائی گئی اور یہ تمام ہنگامۂ وجود اسی لیے برپا کیا گیا ہے کہ اس مخلوق کے سر پر خلافت کا تاج رکھ کر اسے آزمایا جائے اور آخرت تو نام ہی ہے اس مرحلے کا جب اس آزمائش کے نتائج برآمد ہوں گے۔ اس طرح فرشتوں پر آدم کی ہمہ جہتی فضیلت ثابت ہو گئی اور وہ ہنسی خوشی آدم کے آگے جھک گئے۔

تیسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ خلافت و نیابت کی آزمائش میں ایک ازلی دشمن بھی انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے، جس کی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسان کو خدا کی وفاداری سے ہٹا کر اسے خدا کا باغی بنا دے۔ یہ خواہ مخواہ کا دشمن ہے جس کا انسان نے کبھی کچھ نہیں بگاڑا، ابلیس

اپنے غرور اور انسانیت سے حسد کی آگ میں جل رہا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان کو بھی نافرمانی و بغاوت کے اسی مقام تک گھسیٹ لائے جہاں خود ہے۔ ان حقیقتوں کو دوسرے مقامات پر قرآن نے پورے شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میں نے اپنے موضوع کی مناسبت سے اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ حیثیت سمجھ لینے کے بعد دنیوی زندگی کی حقیقت اور مقصدِ وجود کا سمجھنا مشکل نہیں ہے لیکن اس کی تصریح آگے آ رہی ہے۔

دنیوی زندگی کی حقیقت

خلافت و نیابت کی حقیقت ہی یہ ہے کہ اصل مالک کی مرضیات کا اتباع کیا جائے۔ اللہ نے جب سب سے پہلے انسان اور سب سے پہلے خلیفہ ـــ آدم علیہ السلام ـــ کو دنیا میں بھیجا تو واضح ہدایت دے کر بھیجا۔ اس طرح انسان کی زندگی اس دنیا میں جہالت کی تاریکی میں نہیں، بلکہ علم کی روشنی میں شروع ہوئی۔ نوعِ انسانی کی اصل، حضرت آدم علیہ السلام کو یہ جامع ہدایت دے کر دنیا میں بھیجا گیا تھا:

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ○ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ○ (البقرة: ۳۸، ۳۹)

’’پھر اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا، اور جو اسے قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔‘‘

یہی بات سورۂ طٰہٰ میں یوں ارشاد ہوئی ہے:

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًا بَعْضُکُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی○ وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْکًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی○ (طٰہٰ: ۱۲۳، ۱۲۴)

’’فرمایا: تم دونوں یہاں سے اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے، اب اگر میری طرف سے تمہیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ بھٹکے گا، نہ بدبختی میں مبتلا ہوگا اور جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے لیے تنگ زندگی ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔‘‘

اب رہی یہ بات کہ یہ ہدایت کس طرح انسان تک پہنچے گی تو اسے اس آیت میں بیان فرمایا:

يٰبَنِيٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَ اَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ اسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (الاعراف: ۳۵، ۳۶)

''اے بنی آدم! یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں تو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور (اپنے رویہ کی) اصلاح کر لے گا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلے میں سرکشی برتیں گے وہی اہل دوزخ ہوں گے، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

یہ قیامت تک کے لیے ایک جامع ہدایت ہے، جس سے انسان کی دنیوی زندگی کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ انسان دنیا میں خدا کا نائب ہے اور اس کی دنیوی زندگی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ سلطانِ کائنات کے احکام و ہدایات کی پیروی کرے۔ یہی اس کی زندگی کا صحیح رویہ ہے۔ انسانی جدوجہد کا محور منصبِ خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ہے۔ اس آزمائش میں کامیاب ہونا اس کی سعادت اور ناکام ہونا اس کی شقاوت ہے۔ یہ نہیں ہے کہ انسان کو اپنی خلافت سپرد کر کے اللہ نے اس کو اپنی اطاعت پر مجبور کر دیا ہے، بلکہ اس نے انسان کو اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو اطاعت کر کے خدا کی خوش نودی حاصل کرے یا نافرمانی کر کے اس کے غضب کا مستحق ہو۔ خدا نے صاف صاف یہ بات بتا دی ہے کہ اگر انسان اطاعت کا رویہ اختیار کرے تو اس کی جزا یہ ہوگی اور اگر بغاوت کا رویہ اختیار کرے تو اس کی سزا یہ ہوگی۔ اب انسان کو اختیار ہے، اپنے لیے جو رویہ چاہے چن لے۔

سورۂ طٰہٰ کی آیت میں یہ جو کہا ہے کہ جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا اس کے لیے تنگ زندگی ہوگی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ محتاج، تنگ دست اور مفلس ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اطمینان، چین اور سکون اس کی زندگی سے ختم ہو جائے گا، اس کی زندگی نہایت تنگ دلی اور عدم اطمینان کی زندگی ہوگی، کروڑوں پونڈ کی دولت بھی اسے اطمینانِ قلب کی دولت نہ دے سکے گی، اس کا دل ایک طرف تو قناعت، توکل اور ایثار سے خالی ہوگا، دوسری طرف مال کی محبت اسے اتنا حریص بنا دے گی کہ ہفت اقلیم کی بادشاہت بھی اس کے حرص کو ختم کرنے میں ناکام ہوگی۔

ہفت اقلیم ار بگیرد بادشاہ
ہم چناں در بندِ اقلیم دگر

اسی حقیقت کو حدیث میں یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ دنیا کے حریص کا پیٹ مٹی ہی بھر سکتی ہے، یعنی مرنے سے پہلے حرص کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ غرض جو شخص ہدایتِ الٰہی سے منہ موڑ کر زندگی بسر کرے گا وہ امتحان میں ناکامیاب ہوگا۔ ان آیتوں سے واضح ہوا کہ یہ دنیا انسان کے لیے امتحان کا گھر ہے اور یہ ہنگامۂ موت وحیات برپا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان کو آزمایا جائے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً (الملک:۲)

’’وہ جس نے موت اور زندگی اسی لیے پیدا کی کہ تمہیں آزمائے کہ تم میں کس کا عمل اچھا ہے۔‘‘

یہی نہیں، بلکہ یہ ساری کائنات اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ انسان کو اس میں بسایا جائے اور خلافت ونیابت کی عظیم ذمہ داری سونپ کر اس کو آزمایا جائے:

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ وَّکَانَ عَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ط (ہود:۷)

’’اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، جب کہ (اس سے پہلے) اس کا عرش پانی پر تھا۔ تا کہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔‘‘

اس سارے نظامِ کائنات کی تکوین وتدبیر اور اس تمام کارخانۂ ہست وبود کی تخلیق وترتیب صرف اس لیے ہے کہ تمہیں (انسان کو) اس میں بسایا جائے اور تمہیں پیدا کرنے اور دنیا میں بسانے کی غرض یہ ہے کہ تم پر اخلاقی ذمہ داری کا بوجھ رکھ کر اور تمہیں خلافت و نیابت کے اختیارات سونپ کر یہ دیکھا جائے کہ تم میں سے کون اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا ہے اور کون اس میں ناکام ہوجاتا ہے۔ اس کائنات کی تدبیر اور تمہاری تخلیق محض کھیل اور تماشا نہیں ہے، بلکہ یہ کام پوری سنجیدگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اگر تم پر اخلاقی ذمہ داری کا بوجھ ڈال کر اور تمہیں اختیارات سونپ کر تمہیں آزمانا اور تم سے تمہاری زندگی کا محاسبہ کرنا مقصود نہ ہوتا تو یہ سارا ہنگامۂ وجود کسی کھلنڈرے کے کھیل سے زیادہ وقعت نہ رکھتا۔ لیکن یہ کوئی کھیل نہیں ہے، بلکہ ایک دن آئے گا جب تمہاری اس آزمائش کا نتیجہ نکل کر رہے گا۔

مقصدِ وجود

اپنے خالق و مالک کی ہمہ وقتی و ہمہ جہتی اطاعت اور کامل بندگی و عبادت انسان کا مقصدِ وجود ہے۔ منصب خلافت کا حق ادا ہو ہی نہیں سکتا جب تک خدا کی بے چون و چرا اطاعت نہ کی جائے۔ اپنی بندگی و غلامی کا احساس ہی انسان کو سیدھی راہ پر قائم رکھ سکتا ہے، ورنہ ذرا سی غفلت اسے شیطان کا آلۂ کار بنا دیتی ہے اور پھر یہ اپنے آپ کو سنبھال کر نہیں رکھ سکتا۔ کبھی تو اپنے آپ کو جانوروں سے زیادہ فروتر سمجھنے لگتا ہے اور کبھی خود خدا بننے کی سعی شروع کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ اللہ نے اس سے یہی مطالبہ کیا ہے کہ اپنی حیثیت یاد رکھ۔ تو بندہ ہے، خدا نہیں ہے۔ غلام ہے، آقا نہیں ہے۔ خدا نے گم راہ انسانوں کی ہدایت کے لیے جتنے انبیاء بھیجے ان سبھوں نے جو پیغام پہنچایا وہ یہی تھا کہ انسان خدا کی بندگی اختیار کرے۔ تمام انسانوں کو مخاطب کر کے جو مطالبہ کیا گیا وہ یہ تھا:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (البقرۃ:۲۱)

"اے انسانو! بندگی اختیار کرو اپنے اس رب کی جو تمہارا اور تم سے پہلے جو لوگ ہو گزرے ہیں ان سب کا خالق ہے۔ تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت سے ہو سکتی ہے۔"

بندگی، اطاعت اور پرستش، خالق کائنات کے لیے خاص ہونی چاہیے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ جہاں تک بندگی اور پرستش کا تعلق ہے کوئی بھی کسی حیثیت سے اس کا شریک نہیں ہے۔ ہاں اطاعت خدا کے پیغمبروں کی بھی ہے، لیکن یہ اطاعت بھی محض اس لیے ہے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہے اور اس نے اپنے پیغمبروں کی اطاعت کو عین اپنی اطاعت قرار دیا ہے۔ انسان نے جب سے اپنی حیثیت فراموش کی ہے وہ ہمیشہ اسی گم رہی میں مبتلا ہوتا رہا ہے کہ اس نے بندگی، اطاعت اور پرستش میں دوسروں کو خدا کا شریک بنا لیا ہے اور اسی طرح خدا کی خلافت و نیابت میں خیانت کا مرتکب اور بغاوت کا مجرم بنتا رہا ہے۔ خدا نے جن و انس کی تخلیق کا مقصد یہ بیان کیا ہے:

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (الذّٰریٰت:۵۶)

"میں نے جن و انس کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔"

اسی مفہوم کی یہ آیتیں بھی ہیں جو بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں آئی ہیں:

وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ (التوبۃ:۳۱)

’’حالاں کہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پاک ہے ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔‘‘

وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۥ حُنَفَآءَ (البینۃ:۵)

’’اور ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ صرف اللہ کی بندگی کریں، اس کے لیے دین کو خالص کر کے، ہر طرف سے یکسو ہو کر۔‘‘

ہر طرف سے یکسو ہو کر، اللہ کے لیے اس کے دین کو خالص کر کے بندگی و اطاعت کا مفہوم ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی بسر کرنے کا جو طریقہ بتایا اور جو نظام عطا کیا ہے اسی کے مطابق پوری زندگی گزاری جائے۔ انسان کے گھڑے ہوئے ہر قسم کے جھوٹ، شرک اور باطل دین سے کٹ کر خالص الٰہ واحد کی بندگی و اطاعت وہ مقصد عظیم ہے جس کے لیے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ عرصۂ دراز تک انسان اسی طرح زندگی بسر کرتا رہا ہے، لیکن پھر شیطان اور نفس کے اغوا سے جب اس نے یہ سیدھی راہ چھوڑی ہے تو اللہ نے ہمیشہ اس کو اس سیدھی راہ کی طرف واپس لانے کے لیے اپنے پیغمبر اور اپنی ہدایتیں بھیجی ہیں، کیوں کہ خلافت و نیابت کا منصب اللہ کی دی ہوئی نعمتوں اور اس کے عطا کیے ہوئے اختیارات میں آزمائش کے سوا اور کیا ہے؟

قرآن خود کہتا ہے:

وَ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ڮ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (الانعام:۱۶۵)

’’وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں زیادہ بلند درجے دیے، تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز ہے اور بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔‘‘

اس آیت نے انسان کی خلافت، مقصدِ وجود اور دنیوی زندگی کی حقیقت، تینوں کو جمع کر دیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ تمام انسان کرۂ ارض پر خدا کے خلیفہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے بہت ساری

نعمتیں اور ان پر تصرف کے اختیارات انسان کو بخشے ہیں۔ یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ انسانوں یعنی خلفاء کے درمیان مراتب و درجات کا فرق بھی اللہ ہی کا رکھا ہوا ہے۔ نہ تمام انسان اللہ کی نعمتوں کے لحاظ سے برابر ہیں اور نہ تمام انسانوں کے اختیارات یکساں ہیں اور نہ ہر ایک کی قوتِ کارکردگی مساوی ہے۔ اس آیت سے یہ بات بھی پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آئی کہ زمین پر انسان کی خلافت و نیابت اور یہ سب کچھ جو اسے دیا گیا ہے، وہ سب اس کے لیے سامانِ ابتلاء و آزمائش ہے۔ یہ پوری زندگی امتحان اور یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ ہر ایک شخص اپنی حد کے اندر امتحان دے رہا ہے۔ دوسری زندگی میں انسان کے درجات کا تعین اسی امتحان کے نتیجے پر منحصر ہے۔ اگر کوئی انسان اس امتحان میں بالکل ناکام ہو جائے اور خدا کے باغیوں کی صف میں اس کا مقام ہو تو وہاں اسے ربّ سریع العقاب سے واسطہ پڑے گا اور اگر کوئی امتحان میں کامیاب تو ہے، لیکن بھول چوک کی وجہ سے کچھ کسر رہ گئی ہے تو ربّ غفور و رحیم اسے اپنے دامنِ مغفرت و رحمت میں ڈھانک لے گا۔

یہ ہے وہ اصل حقیقت جو انسان کو اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی بتا دی گئی تھی اور اب قرآن اسے قیامت تک بتاتا رہے گا۔ اس تفصیل کے بعد ہر عقل مند آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ انسان کو اگر اس کی یہ حیثیت معلوم نہ ہو تو اخلاق کے معاملے میں اس کا رویہ کتنا مختلف ہوگا۔ میں نے آغاز میں چند ایسے سوالات متعین کیے تھے جن کے صحیح جوابات محض عقل کی مدد سے حاصل نہیں کیے جا سکتے، وہاں عقل سپر رکھ دیتی ہے اور وحیِ الٰہی کی رہنمائی کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ ان میں سے چند سوالات تو یہی تھے جن کی تفصیل اوپر گزری، یعنی انسان کیوں پیدا کیا گیا؟ اس کی حیثیت کیا ہے؟ اور اس کے خالق کا اس سے مطالبہ کیا ہے؟ ان سوالات میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ انسان کس طرح پیدا کیا گیا؟ فلسفۂ اخلاق کے سلسلے میں اس سوال پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ اس لیے چند سطریں اس کے بارے میں بھی لکھی جاتی ہیں۔

انسان کس طرح پیدا کیا گیا؟

یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد انسانیت، شرافت اور مذہب و اخلاق پر جو کچھ بیتی اس میں اس زہریلے نظریے کو بڑا دخل ہے، جس کا خیال شیطان نے چارلس ڈارون کے دل و دماغ میں القاء کیا اور اس نے اسے سائنٹیفک انداز میں مرتب کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا اور یورپ نے، جو

مذہب سے عام بیزاری کی وجہ سے اس طرح کی چیزوں کو قبول کرنے پر آمادہ تھا، اس کو اس طرح قبول کر لیا جیسے یہ بھی کوئی دو اور دو چار کی طرح کا نا قابلِ تردید نظریہ ہے۔ تخلیق انسانی سے متعلق ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے اخلاقِ انسانی کے فلسفے کو بری طرح متاثر کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جب انسان کو جانوروں کی اولاد فرض کر لیا جائے تو اس کے لیے اخلاقی قوانین بھی جانوروں ہی کی زندگی سے حاصل کیے جائیں گے۔ یورپ کے باشندوں نے اپنے آپ کو ترقی یافتہ حیوان فرض کر کے جو کچھ کیا اور جو کچھ کر رہے ہیں، اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس مصیبت کو تو ہم میں کا ہر فرد خود بھگت رہا ہے۔ قرآن قیامت تک کے لیے انسانی زندگی کا نظام ہے، اس لیے اس میں کوئی ایسی بات چھوٹے نہیں پائی جس کو انسانی زندگی کی ہدایت و ضلالت سے تعلق ہو۔ ڈارون کے نظریہ کے بعد جب ہم قرآن کا نظریۂ تخلیق انسانی پڑھتے ہیں تو ہماری عقل صاف محسوس کرتی ہے کہ یہ نظریۂ تخلیق وحیِ الٰہی ہی بیان کر سکتی تھی اور یہ بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی فضیلت و شرافت کے لحاظ سے کون سا نظریہ قابلِ قبول ہے۔

تخلیق انسانی سے متعلق قرآن یہ کہتا ہے کہ انسان کی انسانیت کسی غیر انسانی دور سے نہیں گزری، بلکہ وہ ابتدا ہی سے انسان بنایا گیا ہے اور حیوانیتِ مطلقہ سے کبھی اس کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ سب سے پہلا انسان انسانیت کا فردِ کامل، خدا کا خلیفہ اور اس کا پیغمبر تھا[1]۔ زمین کے اجزاء سے کس طرح انسان کا کالبدِ خاکی تیار کیا گیا، اس کی تفصیل تو ہم نہیں جانتے، لیکن اجمالاً اتنا معلوم ہے کہ پہلے اجزاءِ ارضی سے اس کا پتلا بنایا گیا، پھر اس کو برابر کیا گیا، پھر اللہ تعالیٰ نے روح پھونک کر اس کو جیتا جاگتا انسان بنا دیا، اس کے سامنے تمام فرشتوں کو جھکنے کا حکم دیا، تمام کائنات اس کے لیے مسخر کی اور اپنی خلافت و نیابت کی عظیم ذمہ داری اس کے سپرد کر کے کرۂ ارض کو اس کے لیے دار الامتحان مقرر کیا۔ تخلیق انسانی کی کیفیت سے متعلق چند آیتیں یہ ہیں۔

---

(۱) بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام خدا کے ان رسولوں کی صف میں داخل ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے صحیفے نازل ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ صاحبِ کتاب رسول تھے۔

حضرت ابو ذرؓ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ سب سے پہلے نبی کون تھے؟ حضورؐ نے جواب دیا: آدم۔ میں نے پھر مزید توثیق کے لیے پوچھا کیا وہ نبی تھے؟ آپؐ نے جواب دیا: ہاں، وہ ایسے نبی جن پر خدا کا کلام نازل ہوا، یعنی وہ صاحبِ صحیفہ رسول تھے۔ (مسند احمد)

وَ اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ○ (الحجر:۲۸، ۲۹)

''تصور کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں خمیر اٹھی ہوئی مٹی کے گارے سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کرلوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں، تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔''

اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ ○ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ○ (صٓ:۷۱، ۷۲)

''تصور کرو اس وقت کا جب کہ تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے ٹھیک کرلوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔''

وَ لَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (الاعراف:۱۱)

''ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا، آدم کو سجدہ کرو۔''

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰٓی اَجَلًا ؕ (الانعام:۲)

''وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر تمہارے لیے زندگی کی ایک مدت مقرر کردی۔''

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ ○ (الصّٰفّٰت:۱۱)

''ہم نے ہی ان کو بنایا ہے ایک چپکنے والے گارے سے۔''

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ ○ (الرحمٰن:۱۴)

''انسان کو پیدا کیا بجنے والی مٹی سے، جیسے ٹھیکرا۔''

ان آیتوں سے اتنا تو بہ وضاحت معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے انسان کا مادۂ آفرینش تیار کیا، پھر اس مادے سے اس کا پتلا بنایا اور اس کے بعد اس کی صورت گری کی اور پھر اپنی طرف سے کوئی روح پھونک کر اسے انسان بنایا۔ گویا تین مراتب سے گزر کر آدم علیہ السلام جیتے جاگتے انسان بنے: مٹی سے ایک کالبد کی تخلیق، پھر اس کا تسویہ یعنی شکل وصورت بنانا، اعضا وجوارح کو ترتیب دینا اور قوتوں کا تناسب قائم کرنا، پھر اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک کر اس کالبد خاکی کو زندہ وجود بنا دینا۔ باقی رہی تخلیق وتسویہ اور نفخ روح کی تفصیلی کیفیت تو یہ ہمیں نہیں

معلوم اور اس کے عدمِ علم سے ہمارا کوئی حرج بھی نہیں۔ اس سلسلے میں جس قدر علم دینا ضروری تھا، اللہ نے دے دیا اور جو چیز ہمارے فہم سے باہر تھی اس کی تفصیلی کیفیت اس نے نہیں بتائی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو روح پھونکی ہے اگر چہ اس کی کیفیت ہمارے فہم سے بالا ہے، لیکن اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کا ایک عکس اور پرتو ہے۔ حیات، علم، ارادہ، اختیار، قدرت، عقل و فہم، قوتِ فیصلہ اور اس طرح کی دوسری صفاتِ خیر، جو انسان کے اندر پائی جاتی ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفتوں کا عکس ہیں اور اس کی صفات کا یہی پرتو ہے جس کی وجہ سے اس کالبدِ خاکی کے سر پر خلافتِ الٰہی کا تاجِ کرامت سجایا گیا اور یہی صفات ہیں جن کی بنا پر اسے مسجودِ ملائک بنایا گیا۔ طیش وغرور کی وجہ سے شیطان کی نگاہ اس حقیقت تک نہ پہنچی اور وہ آدم کی خلافت سے انکار کر کے خدا کی رحمت سے دور ہو گیا۔

رہے نوری و ناری دونوں حیراں
جو بیلا لے گیا اک جسمِ خاکی

کائنات میں جتنی چیزیں موجود ہیں وہ سب وجودِ الٰہی کا عکس ہیں۔ وہی ہے جو ان سب پر وجود کا افاضہ کر رہا ہے۔ اگر اس مبدءِ فیاض کی طرف سے ایک لمحے کے لیے افاضۂ وجود رک جائے تو تمام چیزیں فنا ہو جائیں۔ اسی طرح مختلف اشیاء میں الگ الگ جو صفاتِ خیر پائی جاتی ہیں وہ سب بھی صفاتِ الٰہی کا پرتو ہیں۔ لیکن جس جامعیت کے ساتھ وہ صفات انسان کے اندر پائی جاتی ہیں، خدا کی کسی مخلوق میں نہیں پائی جاتیں اور اسی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ ہے۔ جن خوش نصیب انسانوں کو اپنی اس حقیقت کا علم وعرفان حاصل ہو جاتا ہے وہ کائنات میں اپنے سے بلند صرف ایک ذات کو پاتے ہیں اور یہ ذات وہی ہے جس نے ان کو وجود بخشا اور وجود کے ساتھ ساتھ یہ صفات عطا فرمائیں، مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ (جسے اپنے نفس کا عرفان حاصل ہوا اسے اپنے رب کی معرفت نصیب ہوئی) کی حقیقت یہی ہے اور شاید یہی بات ہے جسے وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذّٰریٰت: ۲۱) میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

دو نظریوں کا بنیادی فرق

تخلیقِ انسانی کے متعلق ایک یہ نظریہ ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ اور ایک وہ نظریہ ہے جو

انسان کو اصلِ حیوانی کی ایک فرع قرار دیتا ہے۔ مطلق جانوروں اور انسانوں میں اُس نظریہ کے لحاظ سے کوئی فرق ہے تو صرف یہ ہے کہ دوسرے جانور غیر ترقی یافتہ اور غیر متمدن ہیں اور انسان ترقی یافتہ اور متمدن ہے۔ کیا ان دو نظریوں کی بنا پر انسانی اخلاقیات یکساں ہوسکتی ہیں؟ کیا دونوں کے فلسفۂ اخلاق میں عظیم الشان فرق نہ ہوگا؟ کوئی عقل منداس کا دعویٰ نہیں کرسکتا کہ دونوں صورتوں میں انسان اپنے لیے ایک قسم کے اخلاق پسند کرے گا۔ ڈارون کے نظریہ کے لحاظ سے انسان مجبور ہے کہ اپنے لیے اخلاقی قوانین بھی ان قوانین سے اخذ کرے جن کے تحت دوسرے جانور زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ کوئی قیاسی بات نہیں ہے، بلکہ موجودہ یورپ وامریکہ کی اباحیتِ مطلقہ، مادر زاد ننگوں کے کلب، کم زور انسانوں کا استحصال، غرض ان کا پورا تمدنی ڈھانچہ اسی نظریے پر استوار کیا گیا ہے۔ دوسری طرف قرآن کا نظریہ ہمارے سوچنے کے انداز کو بالکل بدل دیتا ہے، ہمارے ذہن میں ایک عجیب انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اس نظریے کے پیشِ نظر ہم اپنے آپ کو ترقی یافتہ حیوان نہیں، بلکہ اس زمین پر خدا کا خلیفہ سمجھنے لگتے ہیں اور اس تمام کائنات کو اپنی حقیقت کے مقابلے میں ہیچ اور فروتر محسوس کرتے ہیں۔ ہم ایک اخلاقی وجود قرار پاتے ہیں اور ہمارے کندھوں پر خدا کی نیابت کا وہ بوجھ آپڑتا ہے جس کو اٹھانے سے آسمان وزمین اور پہاڑ، سب نے انکار کردیا۔ ہم اپنے آپ کو اپنے خالق ومالک کے سامنے جواب دہ سمجھنے لگتے ہیں اور اپنی زندگی کے قوانین حاصل کرنے کے لیے ہماری نگاہیں عالمِ بالا کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ اس طرح ان دو نظریوں کی وجہ سے نہ صرف اخلاق میں، بلکہ پوری زندگی میں دو مستقل اور مختلف تصورات پیدا ہوتے ہیں اور زندگی کے دو الگ راستے بن جاتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات خود ظاہر ہوئی کہ فلسفۂ اخلاق سے تخلیقِ انسانی کی کیفیت کا سوال کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انسان کس طرح پیدا کیا گیا؟ یہ سوال اتنا اہم ہے کہ دو مختلف جواب سے دو مختلف فلسفۂ اخلاق اور دو مختلف فلسفۂ زندگی پیدا ہوجاتے ہیں۔ کیا انسان اس قدر گر گیا ہے کہ قرآنی نظریے کے مقابلے میں ڈارونی نظریہ پسند کرے گا؟ ڈارون کے جس نظریۂ ارتقاء کو سائنٹیفک اور علمی ومشاہداتی نظریہ کہا جاتا تھا اب خود دوسرے سائنس داں اس کی تغلیط کر رہے ہیں اور زیادہ مدت نہیں گزرے گی کہ انسان کی تخلیق کے متعلق ڈارون کے نظریے کو خود یورپ وامریکہ کے دوسرے سائنس داں بالکل غلط ثابت کر دکھائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ انسان کے

متعلق اس قسم کے جتنے نظریے یورپ میں پیدا ہوئے ان میں سائنسی مشاہدات سے زیادہ سیاسیات کا دخل رہا ہے۔ یہ بات اس وقت میرے موضوع سے الگ ہے، اس لیے میں اس کی کوئی تفصیل پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ وقت آ رہا ہے کہ دنیا کی سیاست بدلے گی۔ اس وقت اس طرح کے خود غرضانہ اور مفاد پرستانہ نظریے اپنی موت آپ مر جائیں گے۔

نظریۂ خلافت اور حکومت و سیاست

اس سلسلہ میں ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے، اس پر بھی یہاں ایک نظر ڈال لینی ضروری ہے، کیوں کہ اجتماعی اخلاقیات سے اس سوال کا گہرا تعلق ہے۔ سوال ہے کہ انسان زمین پر کس چیز میں خدا کا خلیفہ ہے؟ اور یہ خلافتِ ارضی اسے کس لیے دی گئی ہے؟

اس دنیا میں خدا کا فرماں بردار انسان بہت سے کام کرتا ہے۔ مثلاً وہ خدا کو پوجتا ہے، اس کی پرستش کرتا ہے، اس کے سامنے رکوع اور اس کے حضور سجدے کرتا ہے، اس کی تسبیح و تقدیس میں رطب اللسان رہتا ہے اور اس کے سامنے انتہائی عاجزی و نیازمندی کے ساتھ دستِ سوال دراز کرتا ہے۔ لیکن کیا اس کام میں وہ خدا کا خلیفہ ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ کیوں کہ خلافت دراصل اللہ کی نیابت ہے، اس لیے ان کاموں میں خدا کی نیابت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عبادت مخلوق کا خاصہ ہے، خدا کی صفت نہیں ہے۔ اللہ کی ذات اس سے بری ہے۔ اسی طرح انسان کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے اور دوسری بشری حاجات پوری کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں میں وہ خدا کا نائب نہیں ہے۔ تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کس چیز میں خدا کا خلیفہ ہے اور کس کام میں اسے خدا کا نائب کہا جاسکتا ہے؟ اس کا جواب حاصل کرنے کے لیے سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع کی وہ گفتگو سامنے رکھنی چاہیے جو تخلیقِ آدم کے وقت اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کے درمیان ہوئی تھی۔ فرشتوں کے اس استفہام پر غور کیجیے:

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (البقرۃ:۳۰)

''انھوں نے کہا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خوں ریزیاں کرے گا۔''

فرشتوں نے انسان کے جس عیب اور جس کمزوری کا ذکر کیا، اس کا تعلق کس چیز سے ہے؟ کیا اس کا تعلق حکومت و سیاست اور انتظامِ مملکت سے نہیں ہے؟ حکومت نام ہی ہے اس ادارے

کا جو ملک کے انتظام کو درست رکھے، اس کو فساد سے بچائے اور باشندگانِ ملک کی جان مال کی حفاظت کر کے امن و امان قائم کرے۔ فرشتوں نے کہا کہ جو مخلوق تیری زمین کے انتظام کو بگاڑ دے گی اور امن وامان کو درہم و برہم کرے گی، آخر تو اس کے ہاتھ میں عنانِ حکومت کس مصلحت سے دے رہا ہے؟ فرشتوں کا یہ سوال ہی اس بات کا جواب ہے کہ انسان کس چیز میں خدا کا خلیفہ ہے اور خلافتِ ارضی کس لیے اس کے سپرد کی گئی ہے۔ کرۂ ارض پر حکم رانی اور اس کے انتظام کی اصلاح، یہ ہے وہ چیز جس میں انسان کو خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے اور اسی میں وہ خدا کا نائب ہے۔ اگر وہ خدا کی مرضیات کے تحت حکم رانی کرے تو خلیفۃ اللہ فی الارض اور اشرف المخلوقات ہے اور اگر اپنی من مانی حکومت کرے تو خدا کا باغی اور بدترین مخلوق ہے۔

فرشتوں پر انسان کو جو فضیلت حاصل ہے وہ اسی خلافت ارضی اور اس سے متعلق اس جامع علم کی وجہ سے ہے جو اللہ نے صرف انسان کو عطا فرمایا ہے، ورنہ جہاں تک خدا کی پرستش اور اس کی تسبیح و تقدیس کا تعلق ہے، فرشتے انسان سے بہت آگے ہیں۔ عبادت ان صفات میں سے ہے جو مخلوق کے ساتھ خاص ہیں، اللہ کی ذات ان سے پاک ہے۔ فرشتوں کو اس صفت میں امتیازِ خاص حاصل ہے۔ علم اللہ کی سب سے اعلیٰ صفت اور حکم رانی اس کا سب سے بڑا حق ہے۔ فرشتے علم میں بھی انسان سے کم ہیں اور جہاں تک با اختیار حکم رانی کا تعلق ہے، یہ چیز فرشتوں کو عطا ہی نہیں کی گئی، اس لیے انسان کو ان پر فضیلت حاصل ہوئی اور انسان ہی خلافت الٰہی کا مستحق قرار پایا۔ فرشتوں نے وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ (البقرۃ: ۳۰) کہہ کر اپنی عبادت پیش کی تھی اس لیے آدم کے علم کا مظاہرہ کر کے اللہ نے ان کو اس بات پر مطمئن کیا کہ آدم کو جو چیز عطا کی گئی ہے وہ عبادت یعنی پرستش اور تسبیح و تقدیس سے افضل ہے اور جیسا کہ بعض حدیثوں سے اشارتاً معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر گزرا کہ فرشتوں نے اکل و شرب اور اس طرح کی دوسری بشری ضروریات سے بے نیاز اور پاک ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو خدا سے زیادہ قریب سمجھا، کیوں کہ خدا بھی ان باتوں سے بالکل پاک ہے اور اسی بنا پر ان کو خیال ہوا کہ وہ انسان سے اونچا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لیے اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے اہتمام اور ان کی تخلیق کے عدم اہتمام کا ذکر کر کے ان کو مطمئن کیا ہے۔ گویا یہاں انہیں اس طرح مطمئن کیا گیا ہے کہ تخلیق انسانی کا یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے کچھ اور کام لینا ہے اور وہ کام ہے خلافت و

نیابت۔ لہٰذا یہ منصبِ عظیم اس کی فضیلت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

خلیفہ کی جمع خلفاء اور خلائف کے الفاظ تو قرآن میں کئی جگہ استعمال کیے گئے ہیں، لیکن خود خلیفہ کا لفظ غالباً صرف ایک جگہ اور استعمال کیا گیا ہے۔ وہ مقام بھی قابلِ غور ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۢبِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝ (ص:۲۶)

”اے داؤد! ہم نے تمھیں زمین میں اپنا نائب بنایا ہے۔ لہٰذا تم لوگوں میں حق و انصاف کے ساتھ حکومت کرو اور اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو، ورنہ وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ بے شک جو لوگ اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے، اس وجہ سے کہ انھوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا۔“

اس آیت سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ خلافتِ ارضی کی اصل غرض اللہ تعالیٰ کی تشریعی حکومت ہے۔ کہا گیا کہ اے داؤد! میں نے تمھیں زمین پر اپنا نائب بنایا ہے، لہٰذا تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کرو، یعنی حق کے ساتھ حکومت کرنا خلافتِ الٰہی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ اور وزنی ہو جاتی ہے جب اس آیت کے سیاق پر غور کیا جاتا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے ایک محض معمولی لغزش ہو گئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے جب ایک تنازع کا فیصلہ کرا کے ان کو اس پر متنبہ کیا تو انھوں نے اپنی لغزش سے استغفار کیا۔ اس کے بعد ان کی مزید تنبیہ کے لیے یہ آیت نازل ہوئی اور کہا گیا کہ تمھیں خلیفۃ اللہ فی الارض اس لیے بنایا گیا ہے کہ ہر معاملے میں حق و عدل کے ساتھ فیصلہ کرو اور اپنی خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرو، کیوں کہ کسی مطالبہ یا کسی فیصلے میں خواہشِ نفس کی پیروی اس منصبِ عظیم کے خلاف ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ انسان کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ یہاں جو اقتدار اسے بخشا گیا ہے اسے کس طرح استعمال کرتا ہے۔ اگر یہ اقتدار اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے ماتحت استعمال کیا جائے اور ہر معاملے میں اس کی مرضیات کی پیروی کی جائے تو زمین پر یہ خدا کی سب سے بڑی رحمت اور اس کے صفتِ اقتدار کا ایک عکس اور اس کا سایہ ہے۔ اِنَّ السُّلْطَانَ ظِلُّ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ (السنن الکبریٰ للبیہقی) کا جو

ٹکڑا بعض حدیثوں میں آتا ہے اس کا مفہوم یہی ہے اور اگر انسان اسے اپنے بنائے ہوئے قانون کے ماتحت استعمال کرنے لگے تو بغاوت ہے۔ خدا کے فرماں بردار بندوں کا کام یہ ہے کہ اس بغاوت کو خدا کی اطاعت میں بدلنے کی سعی کرتے رہیں، تاکہ خلافتِ الٰہی کی اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوسکیں جو اللہ نے انھیں عطا کی ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ خلافتِ الٰہی کا حکومت وسیاست سے گہرا تعلق ہے۔ یہی وہ امانت (اپنے وسیع معنوں میں) ہے جس کی اہلیت نہ فرشتوں میں تھی اور نہ آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں میں۔ اللہ کی یہ ساری مخلوقات ان صفات سے محروم ہیں جو انسان کو عطا کی گئی ہیں، اس لیے خلافتِ الٰہی کی امانت صرف اس مخلوق ــــ انسان ــــ کو سونپی جاسکتی تھی۔ اس کی تخلیق کا راز ہی یہ تھا کہ اسے قدرت و اختیار سونپ کر آزمایا جائے ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بہ بنامِ منِ دیوانہ زدند

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط (الاحزاب:۷۲)

''ہم نے آسمانوں کو، زمین کو اور پہاڑوں کو امانت دکھائی تو اس کو اٹھانے پر ان میں کوئی تیار نہ ہوا اور یہ سب کے سب اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔''

اسی امانت کی بنا پر انسان سے عبادت (اپنے وسیع معنی میں) اور اقامت دین (اپنے وسیع معنی میں) کا مطالبہ ہے، تاکہ وہ امانتِ خلافت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو کر اپنے حاکم و معبود کے حضور سرخ رو ہو اور اس کی رضا وخوش نودی کی دولتِ بے بہا حاصل کرے۔ خدا کے اتارے ہوئے قانون کے ماتحت اس دنیا کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی دو صورتیں ہیں: اگر زمین کے کسی خطے کا اقتدار ہاتھ میں ہو تو وہاں وہی قانون نافذ کیا جائے جو خدا نے اتارا ہے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں حکومت الٰہی، حکومتِ اسلامی اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہتے ہیں اور اگر اقتدار حاصل نہ ہو، بلکہ حق وہاں عملاً مغلوب ہو اور اختیار وتصرف کی باگ باطل کے ہاتھ میں ہو تو پھر وہاں سعی کی جائے کہ باطل مغلوب اور حق غالب ہو جائے، انسان کے بنائے ہوئے قانون پر خطِ تنسیخ کھینچا جائے اور خدا کے اتارے ہوئے قانون کی تنفیذ

کی جائے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں سعی اقامت دین کہتے ہیں۔ ان دو صورتوں کے علاوہ کوئی تیسری صورت نہیں ہے، جس کے ذریعہ انسان اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ قرآن نے ہمیں اخلاق کا جو فلسفہ دیا ہے اس کے لحاظ سے کسی اجتماع، معاشرہ اور سماج کی مکمل اصلاح ناممکن ہے اگر وہاں قرآن کا قانون نافذ نہ ہو۔

اخلاق اور سیاست کا باہمی تعلق

نظریۂ خلافت اور حکومت و سیاست کے تعلق پر جو کچھ لکھا گیا اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ قرآن ہمیں جو فلسفۂ اخلاق عطا کرتا ہے اس کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے بھی اتنا ہی گہرا ہے جتنا اس کی انفرادی زندگی سے۔ یورپ نے جب مذہب کے وسیع دائرے سے سیاست کو باہر نکالا تو وہ اس پر مجبور ہوا کہ اخلاقیات کو سیاسیات سے علیحدہ کر دے۔ وہاں کے حکماء وعقلاء نے علم الاخلاق اور علم السیاستہ کو الگ الگ اس طرح مرتب کیا جیسے ان دونوں میں کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ آج سے ۳۵، ۴۰ سال پہلے یہ حال تھا کہ کوئی شخص اگر اخلاقیات کو سیاست کا ایک جز قرار دیتا تو یورپ کے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ یہ سن کر حیران رہ جاتے تھے، حالاں کہ خود فلاسفۂ یونان، جو فلاسفۂ یورپ کے استاذ ہیں، اخلاق کو سیاست سے الگ نہیں سمجھتے۔ افلاطون کے نزدیک کوئی جماعت اخلاقی پستی سے اس وقت تک نہیں نکل سکتی جب تک نظامِ سیاست کسی بلند اخلاقی معیار پر قائم نہ ہو۔ اسی طرح ارسطو کے نزدیک کوئی سیاست اس وقت تک کامیاب نہیں کہی جا سکتی جب تک اخلاق سے اس کا گہرا تعلق نہ ہو۔

علم الاخلاق افراد کے باہمی تعلقات سے بحث کرتا ہے اور علم السیاستہ جماعتوں کی تنظیم اور مملکت کے نظم ونسق سے۔ دونوں ایک دوسرے سے قدم قدم پر مدد لیتے ہیں اور معاملات میں اکثر اوقات دونوں کو ساتھ ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ پھر یہ بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے کہ اخلاقیات کو سیاسیات سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ لیکن یورپ کے مدبرین وسیاسیین کو چوں کہ سیاست کے پردے میں چنگیزی کے تماشے دکھانے تھے اس لیے وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ عوام کے ذہنوں سے مذہب واخلاق کو کھرچ کر پھینک دیں۔ ع

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے، جو شخص بھی اسے سمجھ کر پڑھے گا وہ اول نظر میں یہ محسوس

کرلے گا کہ افراد کے باہمی تعلقات ہوں یا جماعتوں کی تنظیم، تدبیرِ منزل (گھر کا انتظام) ہو یا تدبیرِ مملکت، قوموں کے تعلقات ہوں یا بین الاقوامی روابط، قرآن ان سب کی بنیادیں بلند ترین اخلاقی اصول پر رکھتا ہے اور اس کے نزدیک وہ سیاست فساد فی الارض کے مترادف ہے جس کی بنیاد اخلاق پر نہ ہو۔

فلاسفہ کی حیرانی

یونان کے فلاسفۂ اخلاق اور ان کے شاگرد جن سوالات کے خم و پیچ میں الجھ کر رہ گئے، وہ یہ ہیں:

۱- انسان کے لیے وہ انتہائی خیر برتر اور وہ اصلی بھلائی کیا ہے، جس کو حاصل کرنا اس کی تمام جدوجہد کا محور و مقصود ہونا چاہیے؟

۲- خیر و شر کو جاننے کا ماخذ و معیار کیا ہے؟ ہم کس ذریعہ سے یہ معلوم کریں کہ خیر کیا ہے اور شر کیا؟ اچھا کیا ہے اور برا کیا؟ وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر کس کر ہم خیر و شر کو پرکھیں۔

۳- وہ کون سا محرک ہے جو انسان کو خیر کے اختیار کرنے اور شر سے اجتناب کرنے پر آمادہ کرتا ہے؟

۴- اچھے اخلاق کو اختیار کرنے اور برے اخلاق سے اجتناب کرنے کی غرض و غایت کیا ہے؟

۵- انفرادی و اجتماعی اخلاق کی بنیاد ایک ہے یا دونوں کی بنیادیں الگ الگ ہیں؟

ان سوالات پر فلسفیوں نے نظریات در نظریات اور مباحث در مباحث کا جو بھیانک جنگل تیار کیا ہے، اس میں داخل ہوکر کوئی شخص حیرانی و سرگشتگی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ ان میں سے کسی نے ضمیر پر اعتماد کیا ہے اور کسی نے وجدان پر۔ کسی نے استقراء پر بھروسہ کیا ہے اور کسی نے قیاس پر۔ کسی نے جذبات کو رہ نما بنایا ہے اور کسی نے عقل کو۔ ظاہر ہے کہ ان ذرائع و مآخذ سے کوئی ایک جواب حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اگر فلسفی ان سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب حاصل نہ کرسکے تو اس پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

علم الیقین

قرآن کریم نے سب سے پہلے اس پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کے لیے ہمیں وہ ابتدائی سرا عطا

کیا جس کے بغیر اس کو صحیح طریقے سے حل کرنا ممکن نہیں۔ یہ ابتدائی سرا کیا ہے؟ اس کی تفصیل سے راقم الحروف فارغ ہو چکا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ لینے کے بعد بادنیٰ تامل ان سوالات کے صحیح جوابات واضح ہو جاتے ہیں۔ یہاں صرف ایک ہی نظریہ بن سکتا ہے اور انسان، نظریات اور نظریات کی کوفت سے چھٹکارا پالیتا ہے۔ یہاں صرف ایک ہی بحث کی جاسکتی ہے اور انسان مباحث در مباحث کے جنگل سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ ان سوالات میں فی الواقع تین ہی سوالات ایسے ہیں، جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔ تیسرا اور چوتھا سوال پہلے سوال میں ضم ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز انسان کے لیے انتہائی خیر برتر اور اس کی تمام سعی و عمل کا مقصود ہوگی، اسی کے حصول کا جذبہ محرکِ عمل بھی ہوگا اور وہی اختیار خیر و اجتناب شر کی غرض و غایت بھی ہوگی۔

۱- اس کائنات میں انسان کی اصل حیثیت متعین ہو جانے کے بعد یہ چیز منطقی نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہے کہ جس خدائے برتر کا یہ خلیفہ ہے، اسی کی رضا اس کے لیے انتہائی خیرِ برتر اور تمام جدوجہد کا مقصود اصلی ہوگی۔ رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ اس کی سعی و عمل کا محرک بھی بنے گا اور وہی اس کے تمام اخذ و ترک کی غرض و غایت بھی ہوگی۔

۲- انسان چوں کہ سلطانِ کائنات کا بندہ اور اس کا خلاصہ ہے اس لیے اسی کی ہدایت وہ آخری ماخذ اور وہ اصلی کسوٹی ہوگی جس پر کس کر وہ یقین کے ساتھ یہ سمجھ سکے گا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا؟ بھلائی کیا ہے اور برائی کیا؟ ضمیر، وجدان، استقراء، قیاس، جذبات، عقل، ان میں سے کوئی بھی وہ آخری ماخذ نہیں ہے جس کا فیصلہ یقینی اور قطعی ہو۔ یہ سب اپنے اپنے حدود میں کام کرتے ہیں اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن ان میں کسی کو یہ درجہ حاصل نہیں کہ وہ خیر و شر کو پرکھنے کی کسوٹی بن جائے۔

۳- سلطانِ کائنات نے اپنے تمام بندوں کے لیے ایک مکمل نظام نازل فرمایا ہے۔ اس کا ایک خاص فلسفۂ زندگی ہے۔ اس کے کچھ اٹل اصول ہیں، کچھ غیر مبتدل عقائد ہیں۔ انسان کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، نہ ان اصولوں سے ہٹ سکتی ہے اور نہ ان میں ترمیم کر سکتی ہے۔ یہاں یہ ممکن نہیں ہے کہ انفرادی زندگی کے اصول کچھ اور ہوں اور اجتماعی زندگی کے کچھ اور۔ جزئیات و فروع اور تفصیلی احکام کے لحاظ سے یہ تو ممکن ہے کہ بعض احکام فرد کے ساتھ خاص ہوں اور بعض جماعت کے ساتھ مخصوص ہوں، لیکن بہرحال تمام کے تمام

احکام انہی اصولوں پر مبنی ہوں گے، ان سے الگ نہیں ہو سکتے۔

فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات کے ان جوابات میں نہ اینچ پیچ ہے نہ وہ گنجلک ہیں۔ ہر سوال کا ایک ہی جواب ہے اور بالکل یقینی اور اٹل ہے۔ یہ علم الیقین صرف وحیِ الٰہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ یہ خدا کی ہدایت ہی ہے جو انسان کو زندگی کے خوف ناک اندھیرے جنگل میں بھٹکنے سے بچا سکتی اور اسے صاف سیدھی اور روشن شاہ راہ پر چلا سکتی ہے۔ انسان کے دل و دماغ پر مذہب دشمنی اور مادہ پرستی کے جو پردے پڑ گئے ہیں انہیں اٹھا کر وہ غور کرے تو اس حقیقت تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں ہے، کیوں کہ یہ وہ حقیقت ہے جو خود اس کی اپنی فطرت سے موافقت و مطابقت رکھتی ہے۔

رضائے الٰہی

بندۂ مومن کی تمام سعی و عمل کا محرک اور اس کا ہدفِ مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ خدا کی خوش نودی اس کے اتارے ہوئے دین پر عمل کرنے اور اس کے احکام کی پیروی سے حاصل ہوتی ہے۔ اوامر کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب، یہی وہ ذریعہ ہے جس سے وہ اپنے مالک کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود واضح ہوتی ہے کہ اسلامی فلسفۂ اخلاق کی رُو سے کسی کام کے 'خیر' ہونے کی دو اہم ترین شرطیں ہیں: حسن نیت اور اتباعِ امر۔ ہر کام میں رضائے الٰہی کو مقصود بنانا حسنِ نیت ہے اور ہر کام میں اللہ و رسول کے حکم کی پیروی اتباعِ امر ہے۔ یہ دو شرطیں اگر غائب ہوں تو بڑا سے بڑا کام بھی خیر باقی نہیں رہتا بلکہ شر بن جاتا ہے، چاہے بظاہر وہ کتنا ہی بھلا اور عمدہ معلوم ہو رہا ہو۔ اللہ کے راستے میں جان و مال کی قربانی بہت بڑا خیر ہے، لیکن اگر یہ حسنِ نیت اور اتباعِ امر سے خالی ہے تو پھر خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ کتاب و سنت میں بندۂ مومن کی جدو جہد کے اس محرک اور اس کے اس ہدفِ مقصود کی مختلف تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ تمام مختلف تعبیرات کی روح ایک ہی ہے۔ ابتغاء مرضات اللّٰہ، ابتغاء رضوان اللّٰہ، ابتغاء وجہ اللّٰہ، آخرت کی کامیابی، جنت کی طلب، جہنم سے استعاذہ، ان تمام تعبیرات کا ہدفِ مقصود صرف ایک ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی کا حصول۔ راقم الحروف نے ان مختلف تعبیرات پر جو کچھ غور کیا ہے، اس کا حاصل یہی ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حصولِ جنت کو مقصود اور اپنے اعمال کی غرض و

غایت بنانا رضائے الٰہی کے حصول کو مقصود بنانے سے کوئی الگ اور مختلف شے نہیں ہے، بلکہ دونوں ایک ہیں۔ اسی طرح مرضات اللہ کی طلب اور وجہ اللہ کی طلب ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے کی چند آیتیں یہاں پیش کی جائیں۔

ابتغاء مرضات اللّٰہ: انسان کے پاس دو ہی چیزیں ہیں جنہیں وہ خدا کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے قربان کرسکتا ہے: جان اور مال۔ بندۂ مومن کی جان کے بارے میں ارشاد ہوا:

مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ○

(البقرۃ:۲۰۷)

''لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو اللہ کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچتے ہیں، اور اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔''

اس آیت سے پہلے منافقین کا ذکر ہوا ہے، جو بدترین خلائق ہیں اور اس آیت میں اُن مخلصین کا ذکر ہو رہا ہے، جو بہترین خلائق ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کا مقصود دنیا نہیں ہے، بلکہ ان کا ہدفِ مقصود ربِ دنیا کی خوش نودی ہے، دنیا کے کسی فائدے کا کیا ذکر۔ یہ اس راہ میں اپنی جان قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ انفاقِ مال کے متعلق فرمایا:

مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثۡبِیۡتًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبۡوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتۡ اُكُلَهَا ضِعۡفَیۡنِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ یُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ○ (البقرۃ:۲۶۵)

''جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر کوئی باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے، تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔''

اس آیت سے ایک اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ مل رہا ہے، اسے بھی ذہن نشیں رکھنا چاہیے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ایک کام دو اشخاص ایک ہی نیت سے کرتے ہیں، لیکن نیت کے کمال اور جذبۂ خیر کی شدت کے لحاظ سے دونوں کے درجات میں فرق ہو جاتا ہے۔ ایک نیکی کا اجر دس گنے سے سات سو گنے تک، نیت کے درجات کمال ہی کے لحاظ سے مختلف ہو جاتا ہے۔

وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (النساء:۱۱۴)

"اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔"

اتباع رضوان اللّٰہ: ابتغاء مرضات اللہ ہی کی دوسری تعبیر اتباع رضوان اللہ ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (آل عمران:۱۶۲)

"کیا ایک شخص جو اللہ کی مرضی کا تابع ہے اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے، جس نے خدا کا غضب کمایا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، جو بدترین ٹھکانا ہے۔"

پھر آگے چل کر غزوۂ احد کے ان زخمی مجاہدین کی تعریف کرتے ہوئے، جنھوں نے اپنی خستگی کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ۝ (آل عمران:۱۷۴)

"آخر کار وہ اللہ کی عنایت سے اس طرح پلٹ آئے کہ ان کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچا اور انہوں نے اللہ کی مرضی کا اتباع کیا۔ اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔"

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا گروہ، انبیاء علیہم السلام کے سوا تمام انسانی گروہوں میں افضل ترین و اشرف ترین گروہ ہے۔ اسی گروہ کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک جگہ اور فرمایا:

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا (الفتح:۲۹)

"تم انہیں رکوع اور سجدے کرتے ہوئے دیکھو گے۔ (وہ اس حال میں) اللہ کا فضل اور اس کی رضا ڈھونڈ رہے ہیں۔"

عبادات میں نماز کا جو درجہ ہے وہ معلوم ہے۔ قرآن نے کہا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ساتھی اس عظیم ترین عبادت میں بھی اپنے سامنے جو مقصد رکھتے ہیں وہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کا حصول ہے۔ ان کی تمام سجدہ ریزیاں اسی لیے ہیں کہ ان کا مالک ان سے خوش ہو جائے اور انہیں اپنے فضل سے نوازے۔

ابتغاء وجہ اللّٰہ: اسی ایک حقیقت کی ایک تعبیر ابتغاء وجہ اللہ بھی ہے۔ جن آیتوں میں

اس کا ذکر آیا ہے ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتغاء مرضات اللہ، اتباع رضوان اللہ سے کوئی مختلف چیز نہیں ہے۔ سورۂ رعد میں ایک مقام پر یہ بتایا ہے کہ جو لوگ خدا کی اتاری ہوئی کتاب کو حق جانتے ہیں وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتے جو اس حقیقت سے اندھے ہیں۔ دونوں کو یکساں سمجھنا پرلے درجے کی حماقت ہے اور نصیحت عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں۔ عقل والوں کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی ایک صفت یہ بتائی گئی ہے:

وَ الَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً وَّ یَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (الرعد:۲۲)

"ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے۔"

صبر ہو یا اقامت الصلوٰۃ، انفاق فی سبیل اللہ ہو یا برائی کو بھلائی سے دفع کرنا، ان تمام چیزوں کا مقصد رضائے الٰہی کی تلاش ہے۔ اس آیت کے پہلے ٹکڑے کی تشریح میں حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ أی عن المحارم والمآثم ففطموا انفسهم عن ذالک للہ عز وجل ابتغاء مرضاته و جزیل ثوابه (تفسیر ابن کثیر: ج ۲/ ۵۱۰)

"صبر کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے گناہوں کے ارتکاب اور خدا کی حرام کردہ اشیاء کے استعمال سے اپنے نفوس کو روکا اور یہ صبر انہوں نے اللہ کی خوشنودی اور اس کے عظیم اجر کو حاصل کرنے کے لیے کیا۔"

سرداران قریش اپنی دولت، جاہ و منصب اور شرافتِ نسبی کے غرور میں غریب مسلمانوں پر [illegible] کیا کرتے تھے اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ان لوگوں کو وہ اپنے پاس سے ہٹا دیں تو شاید وہ ان کی بات سننے پر آمادہ ہوجائیں۔ قرآن نے ان کا جواب اور حضورؐ کو ہدایت دیتے ہوئے فرمایا:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الانعام:۵۲)

''اور جو لوگ اپنے رب کو دن رات پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوش نودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔''

مسلمان اللہ کی پرستش میں لگا ہوا ہو یا کسی دوسرے انسان کی مدد اور اس کے ساتھ حسن سلوک میں، ہر وقت اور ہر کام میں اس کا ہدفِ مقصود یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو آخرت کے عذاب سے بچائے اور خدا کی رضا حاصل کرے۔ ایسے ہی مسلمانوں کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا ○ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ○ (الدہر:۸-۱۰)

''وہ خود کھانے کی رغبت و محبت رکھتے ہوئے محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور یہ کہتے ہیں) ہم تمہیں صرف اللہ کی خوش نودی حاصل کرنے کو کھلاتے ہیں، ہم تم سے اس کا نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر گزاری۔ ہم اپنے مالک سے ڈرتے ہیں ایک ایسے دن سے جو بڑا اداس اور سخت ہوگا۔''

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ کا مطلب یہاں بھی ابن کثیر ای رجاء ثواب اللہ رضا بتاتے ہیں، یعنی کھانا کھلانے کی غرض صرف اللہ کے اجر اور اس کی رضا کا حصول ہے۔ یہی حقیقت ایک مقام پر یوں منکشف کی گئی ہے۔

وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ○ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ○ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ○ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ○ (الیل:۱۷-۲۰)

''عن قریب جہنم سے اسے بچایا جائے گا جو سب سے زیادہ متقی ہے، جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے، اور کسی کا اس پر احسان نہیں ہے جس کا بدلہ دیا جائے (بلکہ وہ مال صرف کرتا ہے) اپنے رب اعلیٰ کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے۔''

جن افعال و اعمال اور جن حالات و کیفیات کے ضمن میں مرضات اللہ اور رضوان اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ٹھیک انہی کی طرح وجہ اللہ کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، اس لیے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وجہ اللہ سے ذاتِ الٰہی مراد لے کر ابتغاء وجہ اللہ کا یہ معنی لیا جائے کہ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے عمل کا محرک ذاتِ الٰہی کی طلب ہوتی ہے، اور پھر یہیں سے یہ نتیجہ

نکالا جائے کہ ابتغاء مرضات اللہ اور ابتغاء رضوان اللہ کا درجہ ابتغاء وجہ اللہ سے کم ہے، جن لوگوں نے یہ درجہ بندی کی ہے ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور دلیل نہیں ہے کہ لغت عرب میں وجہ کا اطلاق ذات پر بھی ہوتا ہے، لیکن یہ درجہ بندی کرتے وقت انہوں نے اس طرف توجہ نہ دی کہ قرآن ایک ہی گروہ کے بارے میں حسب موقع یہ تینوں الفاظ استعمال کرتا ہے، جن لوگوں کا محرکِ عمل وہ ابتغاء مرضات اللہ قرار دیتا ہے انہی لوگوں کا محرکِ عمل ابتغاء وجہ اللہ بھی بیان کرتا ہے۔ اور اس پر بھی انہوں نے کوئی توجہ نہ کی کہ ذاتِ الٰہی کی طلب کا مطلب کیا ہوگا؟ کیا کتاب و سنت میں کسی ایک مقام پر بھی ذاتِ الٰہی کو طلب کرنے کی تشویق و ترغیب ملتی ہے؟ کیا کہیں مسلمانوں سے یہ کہا گیا ہے کہ انہیں ذاتِ الٰہی کو طلب کرنا چاہیے؟ جہاں تک راقم الحروف کا مطالعہ ہے، یہ چیز نہ کتاب اللہ میں ملی ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے، وجہ اللہ کا لفظ مرضات اللہ اور رضوان اللہ کے لیے ٹھیک اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح لقاء اللہ کا لفظ آخرت اور آخرت کے حساب و کتاب کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات انسان کے دائرۂ ادراک سے وراء الوراء ہے، اس لیے اس کی رضا و غضب اور اس کے ثواب و عذاب سے الگ ہوکر مجرد اس کی ذات کی طلب مقصود نہیں بن سکتی۔ یہی بہت ہے کہ جنت میں اللہ کے مزید فضل و کرم سے اس کی ایک جھلک نظر آجائے، جنت میں خدا کا دیدار اس کی تمام نعمتوں سے بڑی نعمت ہے، اگر ذاتِ الٰہی کی طلب کا مقصد یہی دیدار ہے تو مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہ چیز اللہ کے صالح بندوں کے لیے ان کے ایمان و عمل کی ایک مزید جزا ہوگی اور بس، لیکن افسوس کہ جو لوگ ذاتِ الٰہی کی طلب کو مقصودِ اعلیٰ قرار دیتے ہیں وہ صرف اتنے پر بس نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں کچھ اشارے اس بحث کے آخر میں آئیں گے۔

آخرت کی کامیابی

خدا پرستی اور مادہ پرستی کا بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ خدا پرست اس مادّی دنیا کو سب کچھ نہیں سمجھتا، بلکہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا یعنی آخرت پر یقین رکھتا ہے۔ اسے اس حقیقت پر ایمان ہے کہ ایک یوم النشور، یوم البعث، یوم الحساب اور یوم الدین آکر رہے گا، جس میں اپنی پوری زندگی کا حساب دینا ہوگا۔ اسی دن کی کامیابی و ناکامی وہ اصل چیز ہے جسے ایک عقل مند انسان کو زندگی بھر اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ مادّہ پرست اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتا ہے اور اللہ کی

لقاء یعنی آخرت کے حساب وکتاب کا انکار کرتا ہے۔ آخرت کے ذکر سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ میں موضوع بحث کی مناسبت سے یہاں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آخرت کی کامیابی و ناکامی ہے کیا؟ ایک جگہ قرآن نے بڑے جامع انداز میں اس پر روشنی ڈالی ہے:

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ○ (آل عمران:۱۸۵)

''ہر شخص موت کا مزا چکھنے والا ہے اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو، کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔''

اس آیت نے واضح الفاظ میں یہ بتا دیا کہ آخرت کی کامیابی نام ہے دخول فی الجنۃ کا اور آخرت کی ناکامی نام ہے دخول فی النار کا۔ جنت خدا کی رحمت و رضا اور جہنم اس کے غضب و سخط کا مظہر ہے۔ جس سے وہ راضی ہوگا اس کے لیے جنت اور جس سے وہ ناراض ہوگا اس کے لیے جہنم ہے۔ جو لوگ جنت کے حصول اور جہنم سے نجات کے لیے کوشاں ہیں وہ فی الاصل خدا کی رضا ڈھونڈ رہے ہیں اور جو لوگ رضائے الٰہی کے لیے سرگرم عمل ہیں وہ فی الواقع جنت کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔

قیامت میں جب تمام انسانوں کا حساب لیا جائے گا تو ان کے صرف دو گروہ ہوں گے۔ فریق فی الجنة و فریق فی السعیر۔ ایک گروہ جنت میں جائے گا اور دوسرا جہنم میں۔ خدا کے نیک بندوں کے لیے وہ ایک مبارک دن ہوگا جب ان کا مالک ان کے نفوس مطمئنہ سے مخاطب ہو کر فرمائے گا:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ○ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ○ وَ ادْخُلِيْ جَنَّتِيْ○ (الفجر:۲۷-۳۰)

''اے نفس مطمئنہ! اپنے رب کی طرف پلٹ، بایں حال کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، تو میرے (فرماں بردار) بندوں میں شامل ہو اور چل میری جنت میں داخل ہو جا۔''

یہی وہ لذتِ مخاطبت ہے جس کے حصول کے لیے خدا کا بندہ وہ سب کچھ کرتا ہے، مالک جس کے کرنے کا حکم دے اور وہ سب کچھ چھوڑتا ہے، مالک جس کے چھوڑنے کا اشارہ کرے۔

رضائے الٰہی اور حصولِ جنت چوں کہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں، اس لیے قرآن نے اسے فوزِ عظیم اور فوزِ کبیر قرار دیا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اسی کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہونے کی ترغیب دی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○ (الحدید:۲۱)

"دوڑو اپنے رب کی بخشش اور جنت کی طرف جس کا پھیلاؤ آسمان و زمین کے پھیلاؤ کی طرح ہے۔ اور یہ جنت ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔"

جنت کے حصول کے لیے جدو جہد کا اس سے زیادہ صریح حکم اور کیا ہوگا، لیکن قرآن ترغیب وتشویق کا ایک دوسرا انداز بھی اختیار کرتا ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنے عبادِ مخلصین (منتخب بندوں) کے اجر کا ذکر کیا ہے اور جنت کی نعمتوں کا مختصر تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا ہے:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ○ (الصّٰفّٰت:۶۰، ۶۱)

"بے شک یہی ہے سب سے بڑی کامیابی، اس جیسی چیز کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔"

عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ کا جملہ کس قدر مؤکّد اور زوردار ہے۔ اگر آخرت میں اس سے بھی کوئی بڑی کامیابی ہوتی تو اس کامیابی پر اتنا زور نہ دیا جاتا اور پھر آخر میں یہ نہ کہا جاتا کہ ایسی ہی چیزوں (یعنی جنت کی مذکورہ نعمتوں) کے لیے جدو جہد کرنے والوں کو جدو جہد کرنا چاہیے۔ اسی مقصد کے لیے دوسری جگہ ایک اور اسلوب استعمال کیا گیا ہے:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ○ عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ ○ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ○ يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ○ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ ؕ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ○ (المطففین:۲۲-۲۶)

"بے شک نیک بندے وہاں آرام میں ہوں گے، تخت پر بیٹھے نظارے کرتے ہوں گے، تو ان کے چہروں میں آرام و عافیت کی تازگی پائے گا، انھیں مشک پر مہر لگائی ہوئی خالص شراب پلائی جائے گی، اور اسی میں رغبت کرنے والوں کو مسابقت کرنی چاہیے۔"

تنافس اور منافسہ عربی زبان میں کسی مرغوب شے میں مسابقت (ایک دوسرے پر سبقت اور آگے بڑھ جانے کی کوشش) کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ بات کہی جارہی ہے کہ فی الواقع جنت ہی کی نعمتیں اور اس کے مدارج اس لائق ہیں کہ ان کے حصول میں تنافس ہونا چاہیے اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی سعی کرنی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ جنت کے حصول کی صرف سعی نہیں، بلکہ اس میں منافست اور مسابقت کی ترغیب کیوں دی جارہی ہے؟ اگر یہ ابتغاء رضوان اللہ یا ابتغاء وجہ اللہ سے ادنیٰ درجہ کی چیز ہے تو پھر اس میں مسابقت کے حکم اور ترغیب وتشویق کا کیا معنی ہوگا؟ بات دراصل یہی ہے کہ قرآن نے دونوں کو ایک درجے میں رکھا ہے اور ادنیٰ واعلیٰ کی درجہ بندی کہیں نہیں کی ہے۔ طلبِ رضائے الٰہی اور طلبِ جنت دونوں لازم وملزوم ہیں اور اللہ نے دونوں کو ایک ہی مقام عطا فرمایا ہے۔ فرض کیجیے ایک شخص اللہ کے تمام احکام اس لیے بجالاتا ہے کہ آخرت میں اسے اللہ کی رحمت حاصل ہو اور وہ اس کا مستحق قرار پائے تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہی ہوں گے کہ وہ جنت کا طلب گار ہے، کیوں کہ آخرت میں خدا کی رحمت کا دوسرا نام جنت ہے۔ قرآن میں جنت کی تعبیر کے لیے رحمت کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر فرمایا:

وَ اَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ۝

(آل عمران: ١٠٧)

”رہے وہ لوگ جن کے چہرے (قیامت میں) روشن ہوں گے تو انہیں اللہ کی رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ وہ اس میں رہیں گے۔“

یہاں رحمۃ اللہ جنت ہی کو کہا گیا ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے: فِی الْجَنَّةِ مَاکِثُوْنَ فِیْهَا اَبَدًا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا یعنی ”انہیں جنت میں جگہ ملے گی اور اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، کبھی اس سے نکلنا نہ چاہیں گے۔“

اس موضوع پر ابھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے، لیکن میرا مقصد صرف اتنا بتانا تھا کہ رضائے الٰہی کی طلب اور جنت کی طلب دونوں ایک درجے کی چیزیں ہیں، ان میں اعلیٰ اور ادنیٰ کا فرق نہیں ہے۔ اسی طرح ابتغاء رضوان اللہ اور ابتغاء وجہ اللہ دونوں ایک ہیں۔ ابتغاء وجہ اللہ سے ’ذاتِ الٰہی کی طلب‘ مراد لینا محض لغت کی بنیاد پر تو صحیح ہوسکتا ہے، لیکن قرآن میں اس کا کہیں کوئی اشارہ بھی نہیں پایا جاتا۔ قرآن کے فلسفۂ اخلاق کو پیش کرتے ہوئے اس چیز کی تفصیل یوں

ہی طول کلام کے لیے نہیں کی گئی ہے، بلکہ جہاں تک راقم الحروف کا احساس ہے، ذاتِ الٰہی کو اپنا مقصود قرار دینے سے جو اخلاق پیدا ہوتا ہے وہ بہت سے موقعوں پر کتاب وسنت کی تعلیمات سے ہٹ جاتا ہے اور جب اس میں غلو پیدا ہوتا ہے تو طلب آخرت اور طلبِ جنت کو نہ صرف یہ کہ ادنیٰ درجے کا مقصد قرار دیا جاتا ہے، بلکہ اس کی تخفیف کی جانے لگتی ہے۔ جن لوگوں نے ذاتِ الٰہی کو اپنا مقصد قرار دیا ہے ان کی کتابوں میں آخرت، جنت اور دوزخ کے بارے میں ایسی باتیں ملتی ہیں جن کو پڑھ کر کتاب وسنت کا طالب علم حیران رہ جاتا ہے۔ ذاتِ الٰہی کی طلب اور اس کو اعلیٰ درجے کا مقصد قرار دینے کا خیال کیسے پیدا ہوا؟ اور اس چیز نے دینی لٹریچر میں کس طرح راہ پائی؟ یہ ایک مستقل موضوع ہے اور میں اس وقت اسے چھیڑنا پسند نہیں کرتا۔ قرآن ہمیں جو تعلیم دیتا ہے اس کی رُو سے انسانی اخلاق کا مقصود ومحرک رضائے الٰہی کا حصول ہے، جس کے نتیجے میں آخرت کی کامیابی یعنی جنت حاصل ہوگی۔ اسی حقیقت کو قرآن میں مختلف تعبیرات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے اور سب کا حاصل وہی ایک حقیقت ہے۔

باب چہارم

مکارمِ اخلاق کی تکمیل

اپنے علم وفہم کے مطابق مسائل اخلاق پر اب تک گفتگو کی گئی ہے۔ اس سے ایک طرف یہ بات سامنے آئی ہے کہ انسان کو جانوروں سے الگ کرنے والی چیز دراصل اس کا اخلاقی وجود ہے اور انسان اس وقت تک انسان نہیں ہوسکتا جب تک اس کا اخلاقی وجود اس کے حیوانی وجود پر غالب نہیں آ جاتا۔

یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ غیر الٰہی فلسفۂ اخلاق پیچیدگیوں کو حل کرنے میں کیوں ناکام رہا ہے؟ اور الٰہی فلسفۂ اخلاق یا قرآن کا فلسفۂ اخلاق کس طرح پیچیدہ مسائل کی گرہیں کھول دیتا ہے؟ میرے علم کی حد تک اب کوئی ایسا پیچیدہ مسئلہ باقی نہیں رہا ہے جس پر گفتگو نہ کی گئی ہو۔ اس بحث ونظر کا حاصل کیا ہے؟ یہاں اس سوال پر مختصر روشنی ڈالنی مقصود ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ کا ارشاد ہے:

بُعِثْتُ لِاُ تَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ (السنن الکبریٰ للبیہقی)

''میری بعثت اس لیے ہوئی ہے کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کردوں۔''

ایک جملے کی یہ مختصر حدیث اپنے دامن میں وسیع معانی چھپائے ہوئے ہے۔ اس ارشاد میں حضورؐ نے اپنی بعثت کا مقصد اخلاق حسنہ کی تکمیل قرار دیا ہے، اس لیے ہمیں اس سے سرسری نہ گزرنا چاہیے، بلکہ اس پر اچھی طرح غور وفکر کرنا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا۝ (الفتح:۲۸)

''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا، تاکہ اس کو ہر دین پر غالب کر دے اور اللہ کی گواہی کافی ہے۔''

اس آیت اور اس حدیث پر جب بیک وقت غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تکمیلِ اخلاقِ حسنہ ہی غلبۂ دین وتکمیل دین کا حاصل ہے۔ قرآن نے جب کہا تھا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں نے پسند کیا تمہارے لیے اسلام کو دین۔''

اس کے معنی یہ تھے کہ آج دین کے ساتھ مکارمِ اخلاق کی تکمیل بھی کر دی گئی۔ حضور ﷺ کی دعوت جب عرب میں مشہور ہوئی تو سب سے نمایاں بات، جس کا چرچا ہوا، یہی تھی کہ آپ مکارمِ اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے جب اپنے بھائی انیس کو سیدنا حضرت محمد ﷺ کی خبر دریافت کرنے کے لیے بھیجا تھا تو انہوں نے واپس جا کر جو رپورٹ دی تھی اس میں خاص طور پر یہ بات کہی تھی: رَأَيْتُهٗ يَأْمُرُ بِمَكَارِمِ الْاَخْلَاقِ (بخاری) اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کی جو تعریفیں قرآن میں نازل فرمائی ہیں، ان میں جامع ترین مدح یہ ہے: وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:۴) ''اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔'' مکارمِ اخلاق کا کوئی خلق ایسا نہیں ہے جو آپ میں کمال درجے پر موجود نہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر آپ کے ارشاد بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ مکارم اخلاق کی تکمیل وہی شخص کر سکتا ہے جس میں خود وہ کمال درجے پر موجود ہو۔ گویا وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم:۴) کی آیت کریمہ، ارشادِ نبویؐ کی پرزور تصدیق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کی ذات گرامی کو تا قیامِ قیامت تمام صالح انسانوں کے لیے اسوہ کی حیثیت دی گئی ہے۔

قرآن کریم نے تمام مکارم اخلاق کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے اور حضورؐ کا اخلاق بقول عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قرآن تھا۔ یعنی حضورؐ کی ذاتِ گرامی ان تمام مکارم اخلاق سے آراستہ تھی جن کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ شاعر نے کتنی سچی بات کہی ہے:

لکل نبی فی الانام فضیلۃ　　و جملتھا مجموعۃ لمحمد

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضورؐ نے اپنے ارشادات میں یہ بات واضح فرمادی ہے کہ بہترین وافضل ترین مسلمان وہ ہے جو کمال حسن اخلاق سے آراستہ ہو۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِنَّ مِنْ اَخْیَرِ کُمْ اَحْسَنَکُمْ خُلُقًا (بخاری)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمہارے بہترین لوگوں میں وہ ہے جو اخلاق میں تم میں سب سے اچھا ہو۔''

دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں:

وَ اِنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ اِنَّ خِیَارَکُمْ اَحَاسِنُکُمْ اَخْلَاقًا (بخاری ومسلم)

''حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ تمہارے بہترین لوگ وہ ہیں جو اخلاق میں سب سے اچھے ہیں۔''

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

اِنَّ مِنْ اَکْمَلِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا وَ اَلْطَفُھُمْ بِاَھْلِہٖ (ترمذی)

''ایمان کے لحاظ سے کامل ترین مومنوں میں وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو اور جس کا سلوک اہل وعیال کے ساتھ سب سے عمدہ ہو۔''

یہ تمام حدیثیں فی الواقع اسی ایک ارشاد بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ کی تشریحیں ہیں۔ حسنِ اخلاق کی تکمیل جب مقصد بعثت ٹھہرا تو پھر جس کا دامنِ عمل حسنِ خلق کے درّہائے شاہوار سے جتنا مالا مال ہوگا وہ خدا اور رسول کی نظروں میں اسی قدر باوزن و باعزت ہوگا۔ قرآن نے یہ جو کہا ہے: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (الحجرات:۱۳) تو فی الحقیقت یہ اِنَّ مِنْ اَخْیَرِکُمْ اَحْسَنُکُمْ خُلُقًا کی دوسری تعبیر ہے۔

حسنِ خلق کی تکمیل دنیا میں انسان کو حیاتِ طیبہ کے مدارج عالیہ پر فائز کرتی ہے اور آخرت میں اسی کا نامۂ اعمال سب سے وزنی قرار پائے گا۔

ابو الدرداء رفعہ: مَا مِنْ شَیْءٍ اَثْقَلُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ وَ اِنَّ اللّٰہَ یُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِیَّ. (ترمذی)

''حضرت ابوالدرداء سے یہ حدیث مرفوع آتی ہے: قیامت کے دن مومن کی میزان عمل میں حسن خلق سے زیادہ کوئی شے وزنی نہ ہوگی اور اللہ ہرزہ سرا اور بے شرم سے نفرت کرتا ہے۔''

ایک مومن خدا کے بعد سب سے زیادہ جس ذات والا صفات کا قرب چاہتا ہے وہ خدا کے حبیب محمد ﷺ ہیں اور اگر یہ قرب آخرت میں نصیب ہو تو یہ مومن کی معراج ہے کہ اس سے زیادہ

بلند درجے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ سب سے زیادہ یہ قرب کیسے حاصل ہوگا؟

جابر رفعه: اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ وَ اَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَحَاسِنُكُمْ اَخْلَاقًا وَ اِنَّ مِنْ اَبْغَضِكُمْ اِلَيَّ وَ اَبْعَدِكُمْ مِنِّي مَجْلِسًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرْثَارُوْنَ وَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ وَ الْمُتَفَيْقِهُوْنَ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُوْنَ وَ الْمُتَشَدِّقُوْنَ وَ الْمُتَفَيْقِهُوْنَ قَالَ الْمُتَكَبِّرُوْنَ۔ (ترمذی)

''حضرت جابرؓ سے مرفوع حدیث آتی ہے: رسول خداؐ نے فرمایا: قیامت کے دن تم میں کا وہ شخص مجھے سب سے زیادہ محبوب اور مجھ سے سب سے زیادہ قریب ہوگا جو اخلاق میں سب سے اچھا ہوگا اور اس کے برعکس وہ لوگ ہوں گے جو فضول بکواس کرنے والے، بغیر احتیاط کے باتوں کو طول دینے والے اور 'متفیقہ' ہیں۔ صحابہ نے پوچھا: متفیقہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: تکبر کرنے والے۔''

اگر کوئی مومن یہ درجۂ بلند چاہتا ہے تو سب سے زیادہ اسے اپنے اخلاق درست کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ دین اسلام کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ کوئی شخص یا کوئی جماعت اپنے انفرادی و اجتماعی اخلاق کو اس دین کے بتائے ہوئے اصولوں پر استوار کرلے۔ اسلام کی نظر میں ہر وہ معاشرت گندی، ہر وہ معیشت ناپاک، ہر وہ سیاست لعنت اور ہر وہ ریاست زحمت ہے جس کی عمارت مکارم اخلاق کی محکم اساس پر قائم نہ ہو۔ حدود و قصاص اور قوانین حکومت سے قطع نظر اسلام نے خالص عبادت و پرستش کے جو احکام دیے ہیں ان کی غرض بھی برے اخلاق کی بیخ کنی اور اچھے اخلاق کی پرورش ہے۔

نماز ایک ایسی عبادت ہے جس میں پرستش کے سوا اور کوئی چیز نمایاں نہیں ہے، لیکن اس کا خاصہ بھی قرآن نے یہ بتایا ہے:

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝ (العنکبوت:۴۵)

''تمہاری طرف جو کتاب وحی کی گئی ہے اُسے تلاوت کرو اور نماز قائم کرو۔ بے شک نماز بے حیائی اور بری بات سے روکتی ہے اور بے شک اللہ کی یاد سب سے بڑی ہے اور تم جو کچھ کر رہے ہو، اللہ اس سے باخبر ہے۔''

اس آیت میں رسولِ خدا ﷺ کو مخاطب کر کے پانچ باتیں کہی گئی ہیں: (۱) تم لوگوں کو اللہ کی کتاب سنا کر اوران کے سامنے اس کی تلاوت کر کے فریضۂ رسالت ادا کرتے رہو، لیکن یہ معمولی کام نہیں۔ اس راہ میں بڑے بڑے شیروں کے پتّے پانی اور جگر شق ہوتے ہیں اس لیے (۲) نماز قائم کرو۔ نماز قوت وطاقت کا وہ لازوال خزانہ ہے جو کارِ نبوت کی انجام دہی میں ہر موقع اور ہر موڑ پر داعی کی مدد کرتا اور اسے صراطِ مستقیم پر قائم رکھتا ہے۔ فحشاء و منکر ہی وہ چیزیں ہیں جو کسی داعی میں کم زوری پیدا کرسکتی ہیں اور (۳) نماز وہ سرچشمۂ حسن وخوبی ہے جو ہر بے حیائی اور ہر بری بات سے روکتی ہے۔ (۴) اس حقیقت میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کی یاد سب سے بڑی چیز ہے کیوں کہ وہ خود سب سے بڑا (اَللّٰہُ اکبر) ہے اور جو سب سے بڑا ہو اس کی یاد سب سے بڑی چیز ہونی ہی چاہیے۔ (۵) داعی اور اس کے ساتھیوں کو یہ بات پیش نگاہ رکھنی چاہیے کہ ان کا آقا ان کے ہر عمل سے باخبر ہے اور ممکن نہیں کہ دنیا وآخرت میں وہ ان کے اعمالِ خیر کی قدر نہ کرے۔

یہاں قرآن نے نماز کی سب سے بڑی تاثیر یہی بتائی کہ وہ فحشاء و منکر سے روکنے والی عبادت ہے۔ اللہ کی یاد اور اس کی بارگاہِ عظمت وجلال میں حضورِ قلب اور خشوع وخضوع کے ساتھ حاضری اور اپنی ہر حرکت سے اپنے عجز وناتوانی کا اظہار وہ عمل ہے جو نماز کے جسم میں تقویٰ کی روح پھونک کر اسے زندہ و بیدار کر دیتا ہے اور ممکن نہیں کہ اس روحِ تقویٰ کے ساتھ مومن بے حیائیوں اور منکرات کا مرتکب ہو سکے۔ اس آیت نے ہمارے سامنے وہ کسوٹی رکھ دی ہے جس پر کس کر ہم میں کا ہر شخص اپنی نماز کو جانچ سکتا ہے۔ یہ کسوٹی پرکھ کر بتا دے گی کہ اس کی نماز کھوٹی ہے یا کھری۔ یہ واشگاف کر دے گی کہ اس کے اندر روحِ تقویٰ بیدار ہے یا اونگھ رہی ہے۔ کتاب وسنت کے ارشادات اور سلفِ صالحین کی تصریحات سب اسی طرف رہ نمائی کرتی ہیں۔ طبرانیؒ اور ابن جریرؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلٰوتُهٗ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ لَمْ يَزِدْ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا بُعْدًا.

”جس کو اس کی نماز بے حیائی اور بری بات سے نہیں روکتی وہ خدا سے اسے اور دور کر دیتی ہے۔“

حسن بصری اور قتادہ کے یہ الفاظ بھی ہم تک نقل ہوتے ہوئے پہنچے ہیں۔

مَنْ لَمْ تَنْهَهُ صَلٰوتُهٗ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ فَصَلَاتُهٗ وَبَالٌ عَلَيْهِ.

”جس کو اس کی نماز فحشاء ومنکر سے نہیں روکتی اس کی نماز اس پر وبال ہے۔“

نماز کو اگر نماز کی طرح ادا کیا جائے تو وہ قلبِ مومن میں خشیت الٰہی پیدا کرتی ہے اور یہ خشیت اسے بری باتوں سے روکتی ہے اور اگر پہلے سے کوئی شخص برائیوں میں مبتلا ہوا اور پھر اسے ایمان وصلوٰۃ کی توفیق نصیب ہو جائے تو نماز اسے اس سے روک دیتی ہے۔ یہی بات ہے جو اس حدیث میں بیان کی گئی ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ اِنَّ فُلَانًا یُصَلِّیْ بِاللَّیْلِ فَاِذَا اَصْبَحَ سَرَقَ قَالَ سَیَنْهَاهُ مَا یَقُوْلُ۔ (احمد)

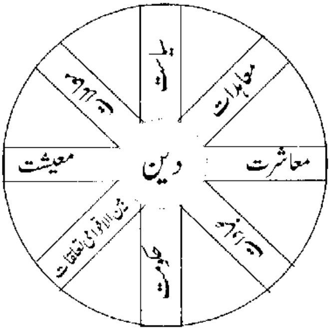
''ابوہریرہؓ سے مروی ہے، ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں شخص رات کو نماز پڑھتا ہے اور جب صبح ہوتی ہے تو چوری کرتا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا: وہ شخص نماز میں جو کچھ پڑھتا ہے عنقریب وہ باتیں اسے چوری سے روک دیں گی۔''

یہ تمام تفصیلات ہمیں بتاتی ہیں کہ نماز جیسی خالص بدنی وقلبی عبادت کی غرض وغایت بھی یہی ہے کہ برے اخلاق سے مومن کا نفس پاک اور اچھے اخلاق سے آراستہ ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں ایک غلط فہمی یا فریبِ نفس کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کتاب وسنت اور سلف کی تصریحات میں نماز کی جو صفت اور اس کا جو خاصہ بیان کیا گیا ہے اس کی غرض یہ نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے کہ کسی مومن کی نماز میں اگر یہ صفت اور یہ خاصہ نہ پایا جارہا ہو تو وہ نماز ترک کردے، بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ مومن اپنی نمازوں میں ذکر اللہ کی وہ کیفیت پیدا کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جو اصلاً مطلوب ومحبوب ہے۔ ترکِ صلوٰۃ کی تو قطعاً کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ نماز پنج گانہ تو پڑھنی ہی پڑے گی، چاہے اس میں روح موجود ہو یا نہ ہو۔ مومن مخلص کا تو کیا سوال ہے، عہدِ رسالت میں منافقین کو بھی نماز ادا کرنی پڑتی تھی۔ قرآن نے ان کی نمازوں کی حقیقت جگہ جگہ بیان کی ہے، لیکن یہ کہیں نہیں کہا ہے کہ وہ نماز کیوں پڑھتے ہیں اور اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ عقلاً بھی یہ بات درست نہیں، کیوں کہ جب تک جسم موجود ہے توقع ہے کہ اس میں روح آجائے اور اگر جسم ہی فنا ہو جائے تو پھر اس کے زندہ وبیدار ہونے کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ایک مومن اگر فریضہ سمجھ کر نمازیں پڑھتا رہے اور بالکل غافل بھی نہ ہو تو پوری امید ہے کہ کبھی نہ کبھی اس کی نمازوں میں وہ روح آجائے جو مطلوب ہے۔ میں نے بعض بے نمازیوں کو یہ کہتے

ہوئے سنا ہے کہ جب میری نماز حقیقی نماز نہیں ہوتی تو اٹھنے بیٹھنے کا کیا فائدہ۔ یہ بہت بڑا فریبِ نفس اور فریبِ شیطان ہے۔ مومن کو جس قدر جلد ممکن ہو اس فریب کے تار پود بکھیر دینے چاہئیں، ورنہ یہ فریب اسے تباہ کر ڈالے گا۔ درمیان میں یہ ایک ضمنی بات عرض کی گئی، اصلاً میں یہ کہہ رہا ہوں کہ نماز ہو یا زکوٰۃ، روزہ ہو یا حج، تمام عبادتیں اسی لیے ہیں کہ نفس کی گندگی کو دور کر کے اسے پاک و پاکیزہ بنائیں، کیوں کہ اس کے بغیر نہ کوئی شخص اپنے نفس کو سنوار سکتا اور نہ فریضۂ اقامتِ دین سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اگر اسلام کے نام پر کوئی حکومت بھی قائم کر لی جائے، لیکن اس حکومت و مملکت میں نیکی آسان اور بدی دشوار نہ ہو، محاسنِ اخلاق غالب اور مساویِ اخلاق مغلوب نہ ہوں تو ایسی حکومت کو اسلامی حکومت کہنا اس نام کی توہین و تذلیل کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس تفصیل کو سامنے رکھنے سے جو نقشہ بنتا ہے وہ یہ ہے:



چند جامع اخلاق

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتابِ ہدایت قرآن کریم اور اپنے آخری نبی برحق سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دین و اخلاق کی تکمیل فرما دی ہے۔ کوئی برا اخلاق ایسا نہیں ہے جس کی نشان دہی کر کے اس کی بیخ کنی نہ کر دی گئی ہو اور کوئی اچھا اخلاق ایسا نہیں ہے جس کی تصریح کر کے اس کا نمونہ دکھا نہ دیا گیا ہو۔ کتاب و سنت میں جن مکارمِ اخلاق کا حکم اور ترغیب دی گئی ہے اور جن مساوی اخلاق سے روکا گیا ہے ان کی اگر فہرست ہی تیار کی جائے تو یہ لمبا کام ہے، چہ جائیکہ ان پر تفصیلی گفتگو۔ اس کام کے لیے ایک ضخیم کتاب درکار ہے، لیکن علماء و حکماء نے چند جامع قسم کے اخلاق حسنہ اور اخلاق سیئہ اس طرح مرتب کر دیے ہیں کہ انھیں اصول کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ کتاب اللہ کی بعض جامع آیات بھی اس طرف رہ نمائی کرتی ہیں۔ ذیل کی آیت نے

جامع قسم کے بنیادی اچھے اخلاق اور برے اخلاق کو یک جا بیان کر دیا ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ وَ إِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النحل:۹۰)

''اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، بدی اور ظلم و سرکشی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تا کہ تم دھیان دو۔''

اس آیت سے پہلے کی آیت یہ ہے:

نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝ (النحل:۸۹)

''ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری جو ہر چیز کا کھلا بیان ہے اور ہدایت و رحمت و بشارت ہے فرماں برداروں کے لیے۔''

اس آیت کے بعد اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ الخ کی آیت گویا تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کو ثابت اور مدلّل کرنے والی آیت ہے۔ آیتِ بالا کی جامعیت کے بارے میں حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے:

و بالجملة إن الآية كما أخرج البخارى فى الأدب والبيهقى فى شعب الايمان والحاكم و صحّحه عن ابن مسعود اجمع آية للخير و الشر و أخرج البيهقى عن الحسن نحو ذلك۔ (روح المعانى)

''بخاری نے الادب المفرد میں، بیہقی نے شعب الایمان میں اور حاکم نے مستدرک میں ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت خیر وشر کے لیے جامع ترین آیت ہے۔ بیہقی نے حسن بصریؒ سے بھی اسی طرح کی روایت نقل کی ہے۔''

یوں تو اس آیت نے عقائد تک کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے، لیکن اس کا براہِ راست تعلق محاسنِ اخلاق و مساویٔ اخلاق سے ہے۔ اچھے اخلاق کو عدل، احسان اور صلہ رحمی میں اور برے اخلاق کو فحشاء، منکر اور بغی میں جمع کیا گیا ہے۔

''ماوردی اور ابونعیم نے معرفۃ الصحابہ میں عبدالملک بن عمیر سے روایت کی ہے، انہوں نے کہا: اکثم بن صیفی کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی اطلاع ملی تو اس نے آپ کے پاس جانا چاہا، لیکن پہلے اس کی قوم کے دو افراد جانے کو تیار ہوئے۔ وہ دونوں آپ کے پاس پہنچے اور کہا، ہم اکثم کے

قاصد ہیں، وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کون ہیں اور کیا لائے ہیں؟ نبی ﷺ نے فرمایا: میں محمد بن عبداللہ ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ پھر آپ نے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ والی آیت تلاوت فرمائی۔ ان لوگوں نے پھر اپنا سوال دہرایا اور آپ نے پھر یہی آیت تلاوت فرمائی، یہاں تک کہ انھوں نے اس کو یاد کر لیا اور پھر واپس جا کر اکثم کو تمام باتیں بتائیں۔ اس نے آیت سن کر کہا: ''میں دیکھتا ہوں کہ وہ مکارمِ اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور برے اخلاق سے منع کرتے ہیں۔'' پھر اکثم نے اپنی قوم سے کہا: اس معاملے میں تمھیں دوسروں سے پیچھے نہ رہنا چاہیے۔

احمد، طبرانی اور بخاری نے الادب المفرد میں ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہی آیت عثمان بن مظعونؓ کے دل میں استقرارِ ایمان کا سبب بنی تھی۔ اس آیت کی جامعیت ہی کی وجہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس کو خطبۂ جمعہ میں داخل فرمایا اور یہ بات ان کے مآثرِ حسنہ میں شامل ہوگئی۔ ایک سے زیادہ علماء کا قول ہے کہ اگر قرآن میں اس آیتِ کریمہ کے سوا اور کوئی آیت نہ ہوتی تو قرآن کے تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہونے کے لیے کافی ہوتی۔'' (روح المعانی)

اس آیت کے بارے میں ابن جریر نے قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

انه ليس من خلقٍ حسنٍ كان أهل الجاهلية يعملون به و يستحسنونه الّا أمر اللّٰه به، و ليس من خلقٍ سيّءٍ كانوا يتعايرون بينهم الّا نهى اللّٰه عنه، و انما نهى عن سفاسف الأخلاق و مذامّها.

''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر ایسے خلقِ حسن کا حکم دیا ہے جس کو اہلِ جاہلیت بہ نظرِ استحسان دیکھتے تھے اور ان کے یہاں اس پر عمل ہوتا تھا اور کوئی برا اخلاق ایسا نہیں ہے جس کو وہ عیب سمجھتے ہوں اور اس سے اللہ نے منع نہ کیا ہو۔ اس آیت میں اللہ نے ردی قسم کے اخلاق سے منع فرمایا ہے۔''

اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل نے یہ آیت سنی تو کہا تھا اِنّ الٰهه ليأمر بمكارم الاخلاق (محمد کا خدا مکارمِ اخلاق کا حکم دیتا ہے)۔

'' قاضی نے اپنی تفسیر میں ابن ماجہ سے حضرت علیؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں: جب اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ اپنے آپ کو قبائلِ عرب کے سامنے پیش کریں تو آپ اس مقصد سے نکلے۔ میں اور ابوبکرؓ بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ہم قومِ عرب کی ایک مجلس میں پہنچے۔ اہلِ مجلس پر سکون و وقار چھایا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکر نے پوچھا: آپ لوگوں کا تعلق کس قبیلے سے ہے۔ انہوں نے جواب دیا: شیبان بن ثعلبہ سے۔ نبی ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ قریش کے

مقابلے میں آپ کی مدد کریں، کیوں کہ قریش نے آپ کی تکذیب کی ہے۔ مقروق بن عمرو نے کہا: آپ ہمیں کس امر کی طرف بلاتے ہیں؟ نبی ﷺ نے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ کی آیت تلاوت فرمائی۔ اسے سن کر مقروق بن عمرو نے کہا: خدا کی قسم، آپ کی دعوت مکارمِ اخلاق اور محاسنِ اعمال کی دعوت ہے۔ وہ قوم خود جھوٹی ہے جو آپ کی تکذیب کرتی ہے۔'' (تفسیر کبیر)

ان تفصیلات سے اور کتاب وسنت میں آیت زیر بحث کے الفاظ جن معانی اور جن مواقع پر استعمال ہوئے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اس بات میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس آیت نے اچھے برے اخلاق کے بیان کو ایسی جامعیت کے ساتھ اکٹھا کر دیا ہے کہ خلق نیک و خلق بد کا شاید کوئی فرد اس سے باہر نہیں رہا ہے۔

میں ان میں سے ہر ایک پر الگ الگ تھوڑی تفصیل سے اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

(۱)

عدل

محاسن اخلاق میں سب سے پہلی چیز جس کا حکم اللہ نے یہاں دیا ہے 'عدل' ہے۔ یہ صفت و خلق اس لائق ہے کہ اس پر اچھی طرح غور کیا جائے اور اس کی وسعت کو اپنے قلب و دماغ میں اس طرح سمیٹ لیا جائے کہ ہمارا ہر قول و فعل اسی کی میزان میں تل کر باہر آنے لگے۔

عدل کی تعریف اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ میں پہلے یہاں تفہیم القرآن کی عبارت پیش کرتا ہوں۔ مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے:

''پہلی چیز عدل ہے، جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے: ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن و تناسب قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔ اردو زبان میں اس مفہوم کو انصاف سے ادا کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو اور پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں، جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔

دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن وتناسب ہے نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افرادِ معاشرے میں مساوات چاہتا ہے، مثلاً حقوقِ شہریت میں۔ مگر بعض حیثیتوں سے مساوات بالکل خلافِ عدل ہے۔ مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان معاشرتی واخلاقی مساوات اور اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمت کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ حقوق میں مساوات نہیں، بلکہ توازن وتناسب ہے اور اس حکم کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔'' (تفہیم القرآن، جلد ۲، ص ۵۶۵)

اس آیت کے تحت عدل کی مذکورہ تشریح سے تسلی نہیں ہوتی۔ سب سے پہلی کھٹک تو یہ پیدا ہوتی ہے کہ آیت میں جس جامعیت وعمومیت کے ساتھ عدل کا حکم دیا گیا ہے، تشریح میں وہ جامعیت وعمومیت غائب ہوگئی ہے اور اس سے عدل کا ایک محدود تصور اور اس کا ایک خاص رخ سامنے آتا ہے۔ یہ لفظ صرف ''لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن وتناسب'' کی حد تک محدود نہیں ہے اور نہ آیت کا سیاق وسباق اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا یہاں یہ محدود معنی لیا جائے۔ دوسری چیز جو سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ اردو میں عدل کا ترجمہ یا مفہوم اگر لفظ انصاف سے ادا کیا جاتا ہے تو اس سے یہ تصور کہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ ''دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو۔'' جہاں تک مجھے معلوم ہے، اردو میں متبادل طور پر انصاف کا لفظ انہیں معانی میں استعمال ہوتا ہے جن میں عدل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے اس بنا پر عدل کے معنی ''مساویانہ تقسیم حقوق'' کے سمجھ لیے ہیں کہ اردو میں اس کا مفہوم انصاف سے ادا کیا جاتا ہے۔ محض اس سبب سے کہ انصاف کا مادہ نصف ہے، اردو میں کوئی بھی اسے تنصیف کے معنی میں استعمال نہیں کرتا۔ اس کے برعکس برابری کا تصور خود لفظ عدل سے پیدا ہوسکتا ہے، کیوں کہ عدل کے بنیادی معانی میں ایک معنی مساوات بھی ہے۔ اس کے علاوہ عربی میں بھی انصاف کا لفظ عدل کے معنی میں بکثرت مستعمل ہے۔ سب سے قدیم ومستند تفسیر ابن جریر کی عبارت یہ ہے:

يقول تعالٰى ذكره اِنَّ اللّٰه يأمر في هذا الكتاب الذى انزله اليك يا محمد بالعدل و هو الانصاف۔

''اس کتاب میں، جسے اے محمد اللہ نے تم پر نازل کیا ہے، وہ عدل کا حکم دیتا ہے اور عدل انصاف ہے۔''

تیسری بات یہ کہ مساوات اور توازن و تناسب میں تضاد کی نسبت نہیں ہے، بلکہ بہت سے مواقع پر توازن و تناسب مساوات ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر توازن و تناسب اور مساوات کا مصداق ایک ہو جاتا ہے۔ اصل میں مساوات عدل کا تمام معنی نہیں ہے، اس کے معانی کا ایک فرد ہے، اس لیے کلیۃً نہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عدل مساوات ہی کا نام ہے اور نہ یہ کہنا درست ہوگا کہ مساوات عدل نہیں ہے، بلکہ توازن و تناسب عدل ہے۔ جو لوگ عدل کے معنی ہر جگہ مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھتے ہیں ان کی تردید بہت سے دلائل سے کی جا سکتی ہے لیکن محض ان کی تردید کے لیے لفظ انصاف کو اس کا سبب بتانا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

عدل کی جامع تعریف اور اس کی تشریح سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی لغوی تحقیق پیش کی جائے۔

عدل کی لغوی تحقیق

صاحب لسان العرب نے عدل کی لغوی تحقیق کئی صفحات میں بیان کی ہے۔ یہاں میرا مقصود اس لفظ کے تمام متعلقات کو پیش کرنا نہیں ہے، بلکہ مختصراً اس کے معانی کا بیان ہے۔

عدل عربی زبان میں ایک مصدر ہے، جو بطور وصف بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ عدالۃ، عدولۃ، معدلۃ بھی اسی مادے کے مصادر ہیں۔ عدل عربی زبان کے کثیر المعانی مصادر میں سے ایک ہے۔ کثیر معانی میں کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو اصل کی حیثیت رکھتے ہیں اور انہی معانی سے اس لفظ کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کچھ دوسرے معانی اس اصل کی فرع ہوتے ہیں۔ عدل جن معانی میں استعمال ہوتا ہے ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقامۃ، استقامۃ اور تسویۃ و مساواۃ کو اصل کی حیثیت حاصل ہے اور دوسرے معانی انہی معانی کی فرع ہیں۔ لفظ اقامۃ کسی شے کی کجی و خرابی کو دور کر کے اس کو سیدھا اور ٹھیک کر دینے اور اس کے تمام حقوق کو پورا کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور مساواۃ دو چیزوں کے درمیان برابری پیدا کرنے کے معنی میں آتا ہے۔

لسان العرب میں ہے: و اذا مال شیء قلت عدلتہ ای اقمتہ فاعتدل ای استقام۔ و فلان یعدل فلانا ای یساویہ۔ پہلے جملے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شے کج ہو اور تم کہو کہ میں نے عدل پیدا کر دیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے اس کو سیدھا کر دیا۔ دوسرے جملے کا مفہوم یہ

ہے: فلاں شخص فلاں آدمی کا عدل ہے، یعنی اس کے مساوی ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا: الحمد للہ الذی جعلنی فی قوم اذا ملت عدلونی کما یعدل السھم فی الثقاف ای قومونی (حمد ہے اس اللہ کے لیے جس نے مجھے ایسی جماعت میں مقرر کیا کہ اگر میں کج ہو جاؤں تو وہ مجھے تیر کی طرح سیدھا کر دیں گے) اس میں جو عدل کا لفظ آیا ہے اس کی تشریح تقویم سے کی گئی ہے۔ اسی طرح کہتے ہیں: عدلت الشیء فاعتدل ای سوّیته فاستوىٰ (میں نے اس میں عدل پیدا کیا تو وہ معتدل ہو گئی، یعنی میں نے اس کو برابر اور ہموار کیا تو وہ برابر و ہموار ہو گئی)۔ قال ابن الاعرابی العدل: الاستقامة۔ (ابن اعرابی نے کہا ہے کہ عدل، استقامت کو کہتے ہیں)۔ قرآن کی آیت خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ (الانفطار:۷) میں بھی عدل کا لفظ تقویم کے معنی میں آیا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث ہے: العلم ثلثة منها فریضة عادلة اس میں فریضہ عادلہ سے مراد میراث کے وہ حصے ہیں جو کتاب و سنت میں بغیر کسی ظلم و جور کے ٹھیک ٹھیک منصفانہ بیان کیے گئے ہیں۔ ثلاثی کا مصدر عدل اور مزید کا مصدر تعدیل ایک معنی میں آتے ہیں۔ مفرداتِ امام راغب میں ہے: العدالة و المعادلة یقتضی معنی المساواة، والعدل ھو التقسیط علیٰ سواء۔ (عدالۃ و معادلۃ وہ لفظ ہیں جو معنی مساواۃ کو مقتضی ہیں اور عدل برابر برابر تقسیم کو کہتے ہیں)۔ عربی زبان میں جب کسی لفظ کے حقیقی مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو عموماً وہ دونوں ایک دوسرے کی تشریح میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ ہم اس لفظ 'عدل' کے ساتھ بھی یہی معاملہ دیکھتے ہیں۔ عدل کا مفہوم اقامۃ سے اور اقامۃ کا عدل سے ادا کیا جاتا ہے۔ لسان میں ہے: کل ما اقمته فقد عدلته اسی طرح اقام المائل کے معنی عدلہ کے آئے ہیں۔ یہی حال استقامۃ، تسویۃ اور مساواۃ کا بھی ہے کہ یہ الفاظ عدل کا مفہوم ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور عدل و اعتدال و تعدیل ان الفاظ کا مفہوم ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اقامۃ، استقامۃ اور تسویۃ و مساواۃ عدل کے حقیقی و اصلی معانی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عدل کے کچھ دوسرے معانی ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) الحکم بالحق، حق کے ساتھ حکومت اور فیصلہ (۲) موازنہ (۳) مثل مثیل و نظیر (۴) قیمت (۵) فدیہ (۶) شرک۔ مثلاً کہا جاتا ہے: عدل الکافر بربه عدلاً و عدولاً، اذا

سوّی به غیره فعبده یعنی کافر نے غیر اللہ کو اپنے رب کا عدیل و مساوی قرار دیا اور پھر اس کی عبادت کی۔و منه حدیث علی رضی اللہ عنه کذب العادلون بک اذا شبّھوک بأصنامھم (جھوٹے ہیں وہ مشرک جنھوں نے تجھے اپنے بتوں سے تشبیہ دی)۔ان معانی کا تعلق عدل کے اصل معانی سے اتنا نمایاں ہے کہ تشریح کی ضرورت نہیں۔

اب یہ دیکھ لینا چاہیے کہ یہ لفظ جب وصف بن کر آتا ہے تو اس کے کیا معنی ہوتے ہیں۔اگر کوئی ذات ایسی ہے جس کا وصف بلا ریب وشک ذاتی طور پر عدل ہو تو وہ ذاتِ الٰہی ہے۔چناں چہ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں ایک اسم عدل بھی ہے۔لسان العرب میں ہے:

و فی أسمائه سبحانه: العدل ھو الذی لاَ یمیل به الھوی فیجور فی الحکم و ھو فی الاُصل مصدر سمّی به فوضع موضع العادل، و ھو أبلغ منه، لأنه جعل المسمّٰی نفسه عدلاً۔

''اللہ سبحانہ کے اسماء میں عدل بھی ہے۔وہ ذات جس کو ہوا و ہوس کسی باطل کی طرف مائل نہیں کرتا لہٰذا وہ اپنے فیصلے میں ظلم نہیں کرتا۔عدل اصل میں مصدر ہے۔اس کو بطور اسم عادل کی جگہ پر رکھا گیا ہے۔عدل عادل سے زیادہ بلیغ ہے، کیوں کہ اس ذات کو عین عدل قرار دیا گیا ہے۔''

یہی لفظ جب کسی انسان کا وصف بنتا ہے، مثلاً رجل عدل تو اس کے معنی ہوتے ہیں: بیّن العدل و العدالة، و ذو عدل المرضی قوله، و ذو عدل المرضی قوله و حکمه یعنی جو عدل والا ہو اس کی عدالت نمایاں ہو اور اس کا قول و حکم پسندیدہ ہو۔شاھد عدل اس گواہ کو کہتے ہیں جس کی گواہی بالکل واقع کے مطابق ہو اور اس میں کذب و باطل کی طرف کوئی جھکاؤ نہ ہو۔ان میں سے ہر معنی اپنے اپنے موقع پر استعمال ہوتا ہے لیکن ان میں سے کسی معنی کو عدل کا کل مفہوم قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

ضدِّ عدل

الاشیاء تتبین بأضدادھا (چیزیں اپنی ضدوں سے خوب واضح ہوتی ہیں) کے اصول پر عدل کی حقیقت جاننے کے لیے ضدِ عدل یعنی ظلم کی حقیقت جاننا بھی ضروری ہے۔اہلِ لغت اور کثیر علماء کے نزدیک ظلم کی حقیقت یہ ہے:

وضع الشیء فی غیر موضعه المختص به اما بنقصان او بزیادة

و اما بعدول عن وقتہ او مکانہ۔ (مفردات راغب)

''کسی شے کو اس کی مخصوص جگہ سے ہٹا کر ایسی جگہ رکھنا جو اس کا محل نہیں ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں۔ اس میں کمی کرنا، زیادہ کرنا، اس کے مناسب وقت سے ہٹانا، اس کی جگہ سے اس کو الگ کرنا۔''

مختصراً ظلم کی تعریف وضع الشئی فی غیر محلہ کے جملے سے کی جاتی ہے۔ اصطلاح شرع میں ظلم حق سے تجاوز کو کہتے ہیں۔ باعتبار تجاوز ظلم کے مدارج بھی کم وبیش ہوتے ہیں، اسی لیے بڑے سے بڑے اور چھوٹے چھوٹے گناہ کو قرآن میں ظلم کہا گیا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش اور ابلیس کے استکبار میں آسمان زمین کا بعد ہے، لیکن دونوں پر ظلم کا اطلاق کیا گیا ہے۔ ظلم کی تین قسمیں ہیں: (۱) انسان اور خدا کے درمیان، اس قسم کے بڑے بڑے ظلم، کفر، شرک اور نفاق ہیں۔ قرآن نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے: اَلَا لَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيۡنَ (ہود:۱۸)۔ وَالظّٰلِمِيۡنَ اَعَدَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا (الدہر:۳۱)۔ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ (الزمر:۳۲)۔ وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (ہود:۱۸) اور اس طرح کی بہت سی آیتوں میں ظالم کافروں مشرکوں اور منافقوں کو کہا گیا ہے۔ (۲) انسان، انسان کے درمیان۔ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ اِلٰى قَوۡلِهٖ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ (الشوریٰ:۴۰)۔ اِنَّمَا السَّبِيۡلُ عَلَى الَّذِيۡنَ يَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ (الشوریٰ:۴۲)۔ وَ مَنۡ قُتِلَ مَظۡلُوۡمًا (بنی اسرائیل:۳۳)۔ اور اسی طرح کی دوسری آیتوں میں ظلم کی یہی قسم مراد ہے۔ (۳) انسان اور خود اس کے نفس کے درمیان۔ فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِهٖ (فاطر:۳۲)۔ وَ مَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ (البقرۃ:۲۳۱)۔ ظَلَمۡتُ نَفۡسِىۡ (النمل:۴۴)۔ اور اسی طرح کی آیتوں میں ظلم کی یہ تیسری قسم مراد ہے اور حقیقت کے لحاظ سے ہر ظلم جو انسان کرتا ہے وہ سب سے پہلے اپنے آپ ہی پر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مقامات پر اللہ نے فرمایا ہے: وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ (النمل:۳۳)۔ وَمَا ظَلَمُوۡنَا وَ لٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ (البقرۃ:۵۷)۔ ظلم کی اس حقیقت کے لحاظ سے انتقاص حق یعنی کسی کے حق کو کم کرنا بھی ظلم ہے اور اس معنی میں بھی قرآن کی کئی آیتیں موجود ہیں۔

ظلم کی اس حقیقت کو جاننے کے بعد عدل کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اگر ظلم خدا کے حق، بندوں کے حق اور اپنے نفس کے حق کو تلف کرنے کا نام ہے تو عدل ان تینوں حقوق کو ادا کرنے کا نام ہوگا۔ اگر ظلم وضع الشئی فی غیر محلہ ہے تو عدل وضع الشئی فی محلہ ہوگا۔ اگر ظلم

حق سے تجاوز کو کہتے ہیں تو عدل دائرۂ حق کے اندر رہنے کا نام ہوگا۔قرآن کریم نے کن کن چیزوں کو عدل اور کن کن چیزوں کو ظلم کہا ہے ان سب کی تفصیل کے لیے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔

عدل کے ہم معنی الفاظ

عدل کا ہم معنی ایک دوسرا لفظ جو قرآن میں بکثرت، اور شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ تعداد میں خود لفظ عدل سے زیادہ استعمال ہوا ہے، وہ قسط ہے۔لسان میں ہے: والقسط بالکسر، العدل و ھو من المصادر الموصوف بھا کعدل۔(قسط کے معنی عدل ہیں اور یہ ان مصادر میں ہے جو مصدر عدل کی طرح وصف بن کر بھی استعمال ہوتے ہیں)۔یقال میزان قسط و میزانان قسط و موازین قسط۔عدل اور قسط میں لغوی استعمال کے لحاظ سے فرق یہ ہے کہ باب مجرد سے قسط کا اسم فاعل صرف ظالم کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، عادل کے معنی میں مقسط استعمال ہوتا ہے۔

سورۂ جن میں ہے: وَ اَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا(الجن:۱۵)۔سورۂ مائدہ میں ہے: وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ(المائدہ:۴۲)۔ان آیات میں قاسط ظالم کے معنی میں اور مقسط عادل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں مقسط بھی ہے۔قسط کے علاوہ تین لفظ اور ہیں جنہیں قرآن نے عدل کے معنی میں استعمال کیا ہے: قسطاس، میزان، حق۔قسطاس اور میزان تو محض لفظ کے اعتبار سے دو ہیں، ورنہ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔قسطاس بھی میزان ہی کو کہتے ہیں۔مفردات میں ہے: والقسطاس المیزان و یعبّر بہ عن العدالۃ کما یعبر عنھا بالمیزان (قسطاس کے معنی میزان کے ہیں اور یہ دونوں لفظ عدالت کی تعبیر کے لیے استعمال ہوتے ہیں)۔امام راغب نے مادہ وزن کے تحت لکھا ہے:

> و قولہ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ اشارۃ الی مراعاۃ العدالۃ فی جمیع ما یتحرّاہ الانسان من الافعال والاقوال
>
> ”اللہ کا قول وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ اور وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ اشارہ ہے عدل کی رعایت کا ان تمام افعال و اقوال میں جن کا انسان قصد کرتا ہے۔“

حق کا لفظ قرآن میں عدل و انصاف کے معنی میں آیا ہے۔سورۂ ص میں ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ (آیت:۲۲)۔فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (آیت:۲۶)۔

عدل کی جامع تعریف

ان پھیلتے ہوئے معانی کو سمیٹ کر عدل کی ایسی تعریف جو سب کو جامع ہو، کیا ہو سکتی ہے؟ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے:

''ہر شے کو وہ مقام دینا اور اس کے ساتھ افراط وتفریط سے بچتے ہوئے کانٹے کی تول وہ معاملہ کرنا جس کی وہ مستحق ہو۔'' میرا خیال ہے کہ اس تعریف میں عدل کی تمام اقسام داخل ہوگئی ہیں۔ انسان کے اپنے نفس سے لے کر کائنات کی تمام حقیقتیں اور تمام اشیاء اس تعریف کے دائرے میں ہیں۔

خلق عدل

اللہ تعالیٰ نے آیت زیر بحث اور دوسری متعدد آیتوں میں عدل وقسط کا جو حکم دیا ہے اس کی حیثیت محض اتنی نہیں ہے کہ انسان کبھی کبھی عدل اختیار کرے اور نہ یہ ہے کہ عدل کی کوئی خاص قسم یا خاص معنی اختیار کرے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اسے اپنی مستقل صفت اور اپنا خلق بنائے اور اس کے کلی وجامع مفہوم کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔ وہ کانٹے کی تول اللہ کے حقوق، بندوں کے حقوق، اپنے نفس کے حقوق اور کائنات کی دیگر اشیا کے حقوق ادا کرے اور اس کا کوئی قول وفعل اس ترازو میں تلے بغیر باہر نہ آئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلق کا اطلاق ہوتا ہی اس صفت پر ہے جو ملکہ یعنی نفس کی کیفیت راسخہ بن جائے۔ کسی خلق سے جب کوئی انسان متصف ہو جاتا ہے تو وہ اس سے دائماً اور بہ سہولت صادر ہوتا رہتا ہے، مثلاً سخاوت جب کسی انسان کا خلق بن جاتی ہے تو اسے بخل سے بیزاری ہو جاتی ہے، اس کے لیے سخاوت آسان اور بخل دشوار ہو جاتا ہے۔ عدل کے لغوی معنی اور اس کی جامع تعریفات سامنے رکھنے کے بعد اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس خلق حسن سے محرومی، ہر خیر سے محرومی اور اس کی یافت ہر چیز کی یافت ہے۔ خدا کی عظیم الشان کائنات عدل ہی کی اساس پر قائم ہے اور اس نے انسان کو زمین کے مختصر کرے پر اپنا خلیفہ اسی لیے بنایا ہے کہ وہ یہاں ہمہ گیر نظامِ عدل قائم کرے۔ یہ وہ صفت ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو انسان توحید کی حقیقت تک بھی نہیں پہنچ سکتا، جو انسانی فلاح وسعادت کی اصل الاصول اور خود اس کائنات کا سب سے بڑا عدل ہے۔ قرآن نے شرک کو 'ظلم عظیم' کہا ہے اور بار بار اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ کی تکرار

کرتا ہے تو وہ اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ جس انسان کی زندگی سر سے پاؤں تک ظلم و جور سے آلودہ ہو اور عدل و انصاف سے یکسر محروم ہو آخر وہ عقیدۂ توحید و آخرت تک کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ عدل کی اس حیثیت کو علماء و حکماء دونوں نے ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں سب سے پہلے عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت کے تحت امام رازیؒ نے جو نفیس بحث کی ہے اس کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

''عدل افراط و تفریط کے درمیان امر متوسط سے عبارت ہے اور یہ ایک ایسا امر ہے جس کی رعایت تمام اشیاء میں واجب ہے۔ ضروری ہے کہ یہاں اس کی تفصیل بیان کی جائے۔ وہ احوال جن کا انسان مکلّف ہے یا تو اعتقادات ہیں یا اعمالِ جوارح۔ تمام اعتقادات میں عدل کی رعایت واجب ہے۔ مثلاً (۱) توحید تعطیل و تشریک کے درمیان عدل ہے۔ خدا کی نفی تعطیل ہے اور ایک سے زیادہ خداؤں کا اثبات تشریک ہے اور اس افراط و تفریط کے درمیان خدائے واحد کا اثبات توحید ہے۔ (۲) تنزیہ تعطیل و تشبیہ کے درمیان امر متوسط ہے۔ نفیِ الٰہ تعطیل ہے اور الٰہ کو کسی مخلوق کا مثل قرار دینا تشبیہ ہے اور اسے جسمیت، جوہریت، اعضاء، اجزاء اور مکان سے منزّہ اور پاک ماننا تنزیہ ہے۔ (۳) یہ قول کہ خدا صفاتِ علم و قدرت سے موصوف نہیں ہے تعطیل محض ہے اور یہ قول کہ اس کی صفات حادث اور متغیر ہیں، تشبیہ محض ہے اور ان دونوں کے درمیان عدل یہ ہے کہ ایک ایسے الٰہ کا اثبات کیا جائے جو عالم، قادر اور حی ہے اور جس کی صفات نہ حادث ہیں اور نہ متغیر۔ (۴) یہ قول کہ بندے کو کسی طرح کی کوئی قدرت و اختیار حاصل نہیں، جبر محض ہے (جبریہ فرقہ یہی عقیدہ رکھتا ہے) اور یہ قول کہ بندہ اپنے افعال میں مستقل بالذات ہے اور خدا کی قدرت و مشیت کو اس میں دخل نہیں، قدر محض ہے (فرقۂ قدریہ معتزلہ یہی عقیدہ رکھتا ہے) اور ان دونوں کے درمیان عدل یہ ہے کہ بندہ اس قدرت و داعیہ کے واسطے سے عمل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ اس میں پیدا کر دیتا ہے۔ (۵) یہ قول کہ خدا اپنے بندۂ مومن کا کسی گناہ پر مواخذہ نہ کرے گا، ایک کنارہ ہے اور یہ قول کہ ایک گناہ کبیرہ پر اللہ اسے مُخلّد فی النار کر دے گا، دوسرا کنارہ ہے۔ اس افراط و تفریط کے درمیان امر متوسط یہ ہے کہ آخر کار جہنم سے وہ گنہ گار بھی نکال لیے جائیں گے جو مومن تھے۔ اعتقادات کی طرح تمام اعمالِ جوارح میں بھی عدل کی رعایت ضروری ہے، مثلاً (۱) ایک فرقہ ایسا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان کوئی ذمہ دار مخلوق ہی نہیں ہے۔ اس پر نہ خدا کی اطاعت واجب ہے اور نہ معاصی سے احتراز ضروری ہے۔ اللہ نے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ دوسری طرف ہندوستان کے بعض فرقے اور فرقۂ مانویہ یہ

عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان پر تمام لذائذ وطیبات سے اجتناب واجب ہے اور ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کو پوری طرح عذاب دے اور ہر اس چیز سے احتراز کرے جس کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو۔ چناں چہ فرقہ مانویہ اچھے کھانوں اور نکاح سے احتراز کرتا ہے، بلکہ آلۂ تناسل کو بے کار کرالیتا ہے اور ہندوستان کے فرقے اپنے آپ کو طرح طرح کی سزائیں دیتے ہیں۔ یہ دونوں عقیدے اور طریقے مذموم اور ظالمانہ ہیں۔ وسط و معتدل یہ شریعت ہے جسے لے کر محمد ﷺ تشریف لائے ہیں۔ (۳) قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں جو اعمال وافعال میں افراط وتفریط سے بچنے کا حکم دیتی ہیں۔ اللہ نے فرمایا: وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا (البقرۃ: ۱۴۳) یعنی تمہیں ایسی امت بنایا جو تمام امور میں افراط وتفریط کے دونوں کناروں سے دور رہنے والی ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا: وَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَ لَمْ یَقْتُرُوْا وَ کَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا (الفرقان: ۶۷) ''وہ لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو اسراف نہیں کرتے اور نہ حد سے زیادہ کمی کرتے ہیں، بلکہ ان دونوں کے درمیان ان کے اخراجات معتدل ہوتے ہیں۔'' تیسری آیت میں کہا: وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ (بنی اسرائیل: ۲۹) ''نہ تو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں باندھ لو اور نہ اسے بالکل کھول دو۔'' نزولِ قرآن کے بعد جب نبی ﷺ نے عبادات میں مبالغہ شروع فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی: طٰہٰ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی (طٰہٰ: ۱-۲) ''ہم نے قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ تم محنتِ شاقہ کرکے اپنے آپ کو تھکاؤ۔'' (تفسیر کبیر)

خلائے بسیط میں مختلف جسامت کے جو بے شمار کرّے تیر رہے ہیں اور ان میں جو نظم وتدبیر قائم ہے اور ان کی جسامت، مسافت اور گردش میں جو توازن وتناسب پایا جاتا ہے وہ اس بات کی ناقابلِ انکار دلیل ہے کہ کسی مدبر حکیم نے عدل تمام کے ساتھ انہیں منظّم ومرتب فرمایا ہے، کیوں کہ توازن وتناسب کے بغیر ایک لمحے کے لیے ان کا موجودہ نظم باقی نہیں رہ سکتا۔ پہلے عقل اجمالاً اس کا ادراک کرتی تھی اور اب طاقت ور دوربینوں کی ایجاد اور سائنس کی ترقی نے اسے امرِ مشاہد بنا دیا ہے اور اب انسانوں نے بہت سے کروں کی مسافتوں، جسامتوں اور ان ی گردشوں کو ناپ بھی لیا ہے۔ امام رازیؒ نے عدل کائنات پر جس انداز میں گفتگو کی ہے اسے پڑھ کر تعجب ہوا۔ بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے اس زمانے کا کوئی شخص گفتگو کررہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مشہور کلمات میں سے ایک کلمہ ہے: و بالعدل قامت السمٰوات والارض (راغب اور آلوسی نے اسے حدیث قرار دیا ہے۔ع) اس جملے کا معنی یہ ہے کہ اگر مقادیر وعناصر متوازن و

متناسب نہ ہوتے، بلکہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے بعض عناصر بعض دوسرے سے زیادہ ہوتے تو غالب، مغلوب پر مستولی ہو جاتا۔ مغلوب کم زور ہو جاتا اور تمام طبائع، عنصر غالب کی طبیعت میں منقلب و متبدل ہو جاتے۔ اگر زمین سے آفتاب کی دوری موجودہ مسافت سے ذرا بھی کم ہوتی تو اس دنیا میں گرمی بہت بڑھ جاتی اور تمام عالم جل کر رہ جاتا اور اگر اس کی موجودہ مسافت سے کچھ بھی زیادہ ہوتی تو تمام عالم برف کی طرح جم جاتا۔ یہی حال کواکب کی مقدار حرکات اور ان کی تیز رفتاری وسست رفتاری کا ہے۔ ان میں کوئی ایک بھی اگر موجودہ حالت سے مختلف ہوتا، اور اگر کسی ایک کی رفتار موجودہ رفتار سے زیادہ یا کم ہوتی تو نظام عالم مختل ہو جاتا اور اس کے تمام مصالح غارت ہو جاتے۔ اس حقیقت کے پیش نظر و بالعدل قامت السموات والارض کا کلمہ ایک سچا کلمہ ہے۔'' (تفسیر کبیر)

عدل کی صفت ایک اور پہلو سے قابل غور ہے۔ اکثر محاسن اخلاق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعتدال و توسط ہی کی وجہ سے محاسن بنتے ہیں۔ ان کا توسط اگر ختم ہو جائے تو پھر خوش خلقی بدخلقی سے بدل جائے گی۔ ہر خلق حسن دو کناروں اور ایک وسط سے مرکب ہوتا ہے۔ دو کنارے افراط و تفریط کے ہوتے ہیں اور وسط معتدل و متوازن ہوتا ہے اور یہی اعتدال و توازن اس میں حسن پیدا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر خلق حسن کی اصل عدل ہے۔ انسان کے اندر جو قوتیں اللہ نے ودیعت رکھی ہیں ان کا حال بھی یہی ہے۔ ان میں سے کوئی قوت افراط و تفریط کی طرف لڑھک جائے تو شر بن جاتی ہے اور معتدل و متوازن ہو تو خیر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انسان کے اندر اللہ نے قوتِ شہوانیہ ودیعت رکھی ہے، جسے قوت بہیمیہ بھی کہتے ہیں۔ اگر یہ نقطۂ اعتدال پر ہو تو اس سے ایک اہم خلق حسن 'عفت' پیدا ہوتی ہے۔ یہی قوت اگر افراط کی طرف لڑھک جائے تو شرہ پیدا ہوتا ہے اور اگر تفریط کی طرف سرک جائے تو خمود پیدا ہوتا ہے۔ شرہ کہتے ہیں لذات میں انہماک کو اور خمود نام ہے قوتِ شہوانی کو معطل و بے کار کر دینے کا۔ یہ دونوں کنارے شر ہیں اور درمیان کا نقطۂ اعتدال خیر ہے۔ صاحب روح المعانی نے عدل کی تشریح میں لکھا ہے:

''عدل تمام فضائل کی اصل ہے۔ اس کے تحت قوتِ عقلیہ کی فضیلت (حکمت)، قوتِ شہوانیہ کی فضیلت (عفت) اور قوت غضبیہ کی فضیلت (شجاعت) داخل ہے۔ ان میں سے ہر فضیلت افراط و تفریط کے دو کناروں کے درمیان امر متوسط ہے۔''

اس تشریح و تفصیل کے بعد صفتِ عدل و عدالت کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم

ہو جاتا ہے کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی ہموار اور متوازن رکھنے کے لیے اس کی کتنی ضرورت ہے۔ سرچشمۂ عدل و انصاف خدائے یکتا و یگانہ نے انسان کی فلاحِ دنیا و آخرت کے لیے جو قانونِ عدل نازل فرمایا ہے اور اس کی اساس پر جو معاشرہ بنتا ہے اس میں کوئی مسلمان اس وقت تک باعزت و باوقار نہیں ہو سکتا جب تک صفت عدل سے متصف نہ ہو۔ دین کے معاملہ میں کسی کی روایت اور نزاع و خصومت میں اس کی شہادت قابل قبول نہ ہو تو اس کی بے وزنی و بے وقری میں کیا شبہ باقی رہتا ہے۔ اسی طرح اگر اسلامی معاشرے کے سربراہ کار ظلم پر اتر آئیں اور خدا کے قانونِ عدل کی پیروی ترک کر دیں تو اس معاشرے کے بگاڑ میں کون سی کسر باقی رہے گی۔ غرض دنیا کا کوئی معاشرہ امن و سکون سے ہم کنار نہیں ہو سکتا اگر اس کے کارندے عدل کو چھوڑ کر ظلم و جور اختیار کر لیں۔

انسان اگر صدق دل سے ہر قول و فعل میں عدل اختیار کرنے کی عادت ڈالے تو رفتہ رفتہ یہ عادت، صفت بن جاتی ہے اور پھر اس کی عقل سلیم کو عدل اور ظلم کے پہچاننے میں دشواری نہیں ہوتی، لیکن جیسا کہ گزشتہ سطور میں بہ تفصیل عرض کیا گیا ہے، تنہا عقل پر بھروسہ صحیح نہیں ہے۔ وحیِ الٰہی کی مدد کے بغیر ہر معاملے میں عدل کی پہچان ممکن نہیں، اس لیے خدا کی اُتاری ہوئی میزانِ عدل قرآن مجید کا اتباع لازمی ہے۔ مکی آیتوں میں زیادہ تر اللہ نے عدل کا اجمالی و کلّی حکم دیا ہے اور مدنی آیتوں میں اس کی تفصیل پیش کی ہے یا جہاں کسی اضافے کی ضرورت تھی وہاں اضافہ کیا ہے۔ اور کوئی اہم معاملہ ایسا نہیں ہے جس میں اس نے اپنا عادلانہ فیصلہ سنا نہ دیا ہو۔ میں یہاں چند مکی و مدنی آیتیں پیش کرتا ہوں، تاکہ اجمال و تفصیل کا فرق واضح ہو اور چند اہم معاملات سامنے آ جائیں۔

چند آیتیں

سورۂ نحل کی زیر بحث مکی آیت کے علاوہ عدل کا اجمالی حکم سورۂ شوریٰ کی آیت ذیل میں ملتا ہے:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَ اسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ هُمْ ۚ وَ قُلْ
آمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَ

رَبُّکُمۡ لَنَاۤ اَعۡمَالُنَا وَ لَکُمۡ اَعۡمَالُکُمۡ ؕ لَا حُجَّۃَ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اَللّٰہُ یَجۡمَعُ بَیۡنَنَا وَ اِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ؕ (الشوریٰ:۱۵)

"لہٰذا تم اسی طرف بلاؤ اور جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے، اس پر قائم رہو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور کہو: ہر اس کتاب پر میرا ایمان ہے جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور مجھے حکم ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں، اللہ ہمارا اور تمہارا رب ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور تمہارے اعمال تمہارے لیے، ہم میں اور تم میں کوئی جھگڑا نہیں، اللہ ہم سب کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔"

کہنے کو تو یہ ایک آیت ہے، لیکن چھوٹے چھوٹے جملوں میں اسلام کے بنیادی عقائد کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ہر جملے پر تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں۔ اس میں ایک جملے کا ہمارے مضمون سے براہِ راست تعلق ہے: "وَ اُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَیۡنَکُمۡ" عدل کا یہ حکم جامع اور کلّی حکم ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ میری حیثیت اللہ تعالیٰ نے حَکَمِ عدل کی مقرر فرمائی ہے۔ میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تمہارے عقیدہ و عمل کی تمام گم راہیوں اور اختلافات میں قولِ فیصل سناؤں اور عدل تمام کے ساتھ صحیح بات تمہارے سامنے پیش کروں اور ہر معاملے میں خود عملی طور پر عدلِ کامل کا نمونہ تمہیں دکھاؤں۔ تم میرے عقیدہ و عمل میں کھلی آنکھوں سے عدل و انصاف کے جلوے دیکھ لو، جس کے بغیر تمہاری زندگیاں تاریک جنگل میں بھٹک رہی ہیں۔

وَ اِذَا فَعَلُوۡا فَاحِشَۃً قَالُوۡا وَجَدۡنَا عَلَیۡہَاۤ اٰبَآءَنَا وَ اللّٰہُ اَمَرَنَا بِہَا ؕ قُلۡ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاۡمُرُ بِالۡفَحۡشَآءِ ؕ اَتَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸﴾ قُلۡ اَمَرَ رَبِّیۡ بِالۡقِسۡطِ ۟ وَ اَقِیۡمُوۡا وُجُوۡہَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ وَّ ادۡعُوۡہُ مُخۡلِصِیۡنَ لَہُ الدِّیۡنَ ۬ؕ کَمَا بَدَاَکُمۡ تَعُوۡدُوۡنَ ﴿ؕ۲۹﴾ (الاعراف:۲۸،۲۹)

"اور یہ لوگ جب کوئی برا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں: اسی طرح ہم نے اپنے باپ دادوں کو کرتے دیکھا ہے اور اللہ نے ہمیں بھی اس کا حکم دیا ہے، تم کہہ دو: اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیتا، اللہ کے بارے میں جہالت کی باتیں کیوں کہتے ہو۔ کہہ دو، میرے رب نے مجھے انصاف کا حکم دیا ہے۔ ہر نماز کے وقت اپنے منہ سیدھے کرو اور اس کو خالص اس کے فرماں بردار ہو کر پکارو۔ جیسا تم کو پہلے پیدا کیا دوسری بار بھی پیدا ہو گے۔"

عرب کے لوگ جاہلیت میں برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے اور اس کے بارے میں ان

کا دعویٰ تھا کہ اس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ اس دعوے کے جواب میں خدا نے دو باتیں فرمائیں: ایک تو یہ کہ خدا بے حیائی کا حکم نہیں دیا کرتا اور دوسری یہ کہ تمہارا یہ دعویٰ خدا پر افترا ہے۔ تمہارے پاس اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ پھر دوسری آیت میں خدا نے اپنے حکم اور اپنی دعوت حق کو نہایت جامع الفاظ میں بیان فرما دیا ہے۔ اس سے، سب سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ بے حیائی کے کام اور خدا پر افترا ظلم ہے۔ خدا عدل وقسط کا حکم دیتا ہے اور اس کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کا نظام عدل وانصاف پر قائم کرے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ عبادت کا وہی طریقہ مقبول ہے جو خدا نے بتایا ہو۔ تیسرا حکم یہ نکلا کہ عبادت خدا کے لیے خالص ہو اور چوتھی حقیقت آخرت سامنے آئی۔

وَ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَ بِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ (الانعام:۱۵۲)

''اور ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو، ہم ہر شخص کو اتنی ہی بات کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو اس کی قدرت میں ہو اور جب بات کہو تو انصاف کی کہو، اگر چہ فریق معاملہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔''

اس آیت میں تین حکم ہیں اور تینوں مل کر ایک جامع حقیقت بن جاتے ہیں: پہلے حکم میں انسان کی پوری تجارتی زندگی آجاتی ہے۔ خرید وفروخت اور بازار کی اصلاح کو معاشرے کی اصلاح میں جو دخل ہے وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ دوسرے حکم میں ادائے شہادت اور انفصال مقدمات کے تمام مسائل آگئے ہیں، بلکہ بعض مفسرین کے نزدیک امر بالمعروف نہی عن المنکر، دعوت دین، قصص وحکایات، پیغام بری اور حاکموں کے زبانی فیصلے بھی اس میں داخل ہیں۔ محکمۂ انصاف کو ہماری زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں جو دخل ہے وہ بھی کسی پر پوشیدہ نہیں ہے اور تیسرا حکم تو ایک ایسا جامع حکم ہے جس سے زندگی کا کوئی معاملہ باہر نہیں ہے۔

مکّی آیتوں میں عدل وقسط کا جو حکم اجمالاً دیا گیا ہے، مدنی آیتوں میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ وَ لَوْ عَلٰٓي

اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَالۡاَقۡرَبِیۡنَ اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰی بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰۤی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ وَ اِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ۝ (النسآء:۱۳۵)

"اے ایمان والو! عدل کے نگراں اس کے قائم کرنے والے اور اللہ واسطے کے گواہ بنو، اگرچہ تمہاری گواہی خود تمہارے خلاف ہو یا ماں باپ کے یا رشتہ داروں کے، اگر کوئی مال دار ہو یا محتاج ہو تو اللہ ان دونوں سے زیادہ مستحق ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو۔ لہٰذا عدل وانصاف میں خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔ اگر تم نے زبان دبا کر بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں سے باخبر ہے۔"

اس آیت میں عدل وقسط کے لحاظ سے مسلمانوں کی پوری حیثیت واضح کردی گئی ہے۔ کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ اور شُهَدَآءَ لِلّٰهِ کے دو ٹکڑوں میں امت مسلمہ کا منصب سمٹ کر آ گیا ہے۔ عدل کی علم برداری اور خدا واسطے کی گواہی، یہ ہے امت مسلمہ کا منصب۔

اپنے مقابلے میں، والدین کے مقابلے میں اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلے میں انصاف پر قائم رہنا اور سچی گواہی دینا آسان کام نہیں ہے اور پھر اس ہمہ گیر انداز میں، جس کا حکم قرآن نے دیا ہے۔ تونگری کی حالت میں اگر اپنے آپ کو یا خاندان کو کچھ نقصان پہنچ جائے تو زیادہ محسوس نہیں ہوتا، لیکن فقر واحتیاج کے عالم میں روش انصاف پر قیام، تازہ وتوانا ایمان اور آخرت کے زندہ یقین کے بغیر ممکن نہیں۔ عدل وانصاف سے علیحدگی کا دوسرا نازک موقع وہ ہوتا ہے جب معاملہ اپنے دشمن سے آپڑتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کی ہدایت یہ ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۫ وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (المائدة:۸)

"مسلمانو! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کو کھڑے ہو جاؤ، کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف سے نہ ہٹو عدل کرو، یہی بات تقویٰ سے زیادہ قریب ہے، اللہ سے ڈرتے رہو، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔"

سورۂ نساء کی آیت کے ساتھ مل کر سورۂ مائدہ کی آیت نے عدل وقسط سے عدول کے ہر

رخنے کو بند کر دیا ہے اور امت مسلمہ کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں پر جم کر کھڑے رہنا ہر بوالہوس کا کام نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس مقام پر جمے بغیر فریضۂ اقامت دین سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ جو گروہ میزان عدل پر خود پورا نہ اترتا ہو وہ دنیا کو کس منہ سے دعوت دے سکتا اور کس طرح اسلام کے نظامِ عدل کو قائم کر سکتا ہے۔

(۲)

احسان

محاسن اخلاق میں دوسری چیز جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے یہاں دیا ہے، احسان ہے۔ اس صفت کی حقیقت سمجھنے کے لیے صفت عدل کی پوری تشریح سامنے رہنی چاہیے۔ کیوں کہ احسان عدل پر ایک اضافہ ہے۔ مولانا مودودی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''دوسری چیز احسان ہے، جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، خوش خلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا۔ یہ انصاف سے زائد ایک چیز ہے، جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ٹھنڈے اور کھرے معاشرے میں کش مکش تو نہ ہوگی، مگر محبت اور شکر گزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاص و خیرخواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا، جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشو ونما دینے والی قدریں ہیں۔'' (تفہیم القرآن، جلد ۲، ص ۵۶۵)

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ ایک جامع آیت ہے اور اس میں جن محاسن کا حکم دیا گیا ہے یا جن برائیوں سے روکا گیا ہے وہ انسان کی انفرادی و اجتماعی دونوں ہی زندگیوں کو گھیرے ہوئے ہیں۔ صفتِ احسان کا انفرادی زندگی سے بھی اتنا ہی تعلق ہے جتنا اجتماعی زندگی سے، اور واقعہ یہ ہے کہ

جب تک ہر فرد کی انفرادی زندگی درست نہ ہو اجتماعی زندگی کے درست ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جماعت افراد کے مجموعہ کا نام ہے اور جب تک ہر فرد اخلاق کی کسوٹی پر کھرا نہ اُترے، جماعتی زندگی کی صفات پروان نہیں چڑھ سکتیں۔

لفظ احسان کے معنی

احسان کا ماخذ 'حسن' ہے اور حسن قبح کی نقیض وضد ہے۔ حسن اچھائی، خوبی اور جمال کو کہتے ہیں۔ اسی سے احسان کا لفظ بنا ہے، جس کے معنی ہوئے کسی چیز کو اچھا بنانا اور اس میں خوبی و جمال پیدا کرنا۔ یہ لفظ جب الیٰ اور با کے صلے کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی حسن سلوک اور نیک برتاؤ کے ہوتے ہیں۔ احسان اور انعام میں فرق یہ ہے کہ احسان کا استعمال انعام سے عام ہے۔ احسان خود اپنے نفس کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور دوسروں کے ساتھ بھی اور انعام صرف غیر کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ لسان العرب میں ہے:

و الفرق بين الاحسان و الانعام أنّ الاحسان يكون لنفس الانسان و لغيره، تقول احسنت الى نفسي و الانعام لا يكون الا لغيره.

''احسان اور انعام میں فرق یہ ہے کہ احسان نفس انسان اور غیر دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ تم کہتے ہو: ''میں نے اپنے نفس کے ساتھ احسان کیا۔'' اور انعام صرف غیر کے لیے ہوتا ہے۔''

قرآن مجید میں یہ لفظ صلے کے بغیر اور صلے کے ساتھ، دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔ چند آیتیں یہ ہیں:

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَ اِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا ؕ (بنی اسرائیل:۷)

''اگر تم نے بھلائی کی تو بھلا کیا اپنا اور اگر برائی کی تو اپنے لیے۔''

وَ اَحْسِنْ كَمَاۤ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ؕ (القصص:۷۷)

''اور بھلائی کر جیسے بھلائی کی اللہ نے تجھ سے اور مت چاہ خرابی ڈالنی ملک میں۔''

وَ قَدْ اَحْسَنَ بِیْۤ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ (یوسف:۱۰۰)

''اور اس نے مجھ پر انعام کیا جب مجھے قید خانے سے نکالا۔''

الَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَ بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ (السجدۃ:۷)

''جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور شروع کی انسان کی پیدائش ایک گارے سے۔''

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَ اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ (التغابن:۳)

"بنایا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ اور صورت کھینچی تمہاری، پھر اچھی بنائی تمہاری صورت اور اسی کی طرف پلٹنا ہے۔"

وَ مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝ (الطلاق:۱۱)

"اور جو اللہ پر ایمان لایا اور نیک عمل کیے اللہ اس کو جنتوں میں داخل کرے گا، جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا، خوب دی اللہ نے روزی۔"

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝ (الرحمٰن:۶۰)

"نیکی کا بدلہ تو نیکی ہی ہے۔"

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝ (الکہف:۳۰)

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیکیاں کیں، ہم نہیں ضائع کرتے اس کا بدل جس نے بھلا کیا کام۔"

وَ السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَ الْاَنْصَارِ وَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (التوبۃ:۱۰۰)

"مہاجرین وانصار میں سے پہلے سبقت کرنے والے اور جو ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ، اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے۔"

ان آیات میں احسان کے لغوی اور شرعی دونوں ہی معنی استعمال ہوئے ہیں۔ احسان کے شرعی معنی میں ایمان اور اخلاص کا اضافہ ہو جاتا ہے، یعنی کوئی خوبی اور بھلائی، کوئی حسنِ سلوک اور فیاضانہ برتاؤ، ایمان اور اخلاص کے بغیر شرعی اصطلاح میں احسان نہیں ہوتا۔ احسان کا درجہ ایمان واسلام کے بعد آتا ہے۔

آیتِ زیرِ بحث کی تشریح

آیت زیرِ بحث میں عدل ہی کی طرح احسان کا لفظ بھی اپنے وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جس طرح عدل کا حکم دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہر مومن عادل بن جائے۔ اسی طرح احسان کا

حکم دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہر مومن محسن بن جائے، اور کوئی شخص اس وقت تک محسن کا لقب نہیں پا سکتا جب تک احسان اس کا خلق اور اس کا وصف نہ بن گیا ہو۔ صفتِ عدل کے ساتھ احسان کا ذکر خود اشارہ کرتا ہے کہ یہ عدل سے کوئی زائد چیز ہے۔

امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں:

و قولہٗ تعالٰی اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ فالاحسان فوق العدل و ذاک إن العدل هو ان یعطی ما علیه و یأخذ ماله، والاحسان ان یعطی أکثر ممّا علیه و یأخذُ اقلّ مما له، فالاحسان زائد علی العدل.

''اللہ نے عدل اور احسان کا حکم دیا ہے۔ احسان عدل سے زائد ہے، کیوں کہ عدل یہ ہے کہ کوئی شخص دوسروں کا واجبی حق ادا کرے اور اپنا واجبی حق وصول کرے اور احسان یہ ہے کہ دوسرے کو واجبی حق سے زیادہ دے اور خود واجبی حق سے کم لے۔ اس سے معلوم ہوا کہ احسان عدل سے زائد شے ہے۔''

اسی طرح اللہ تعالٰی کی طاعت وعبادت کے جسم میں احسان کی روح اس وقت جلوہ گر ہوتی ہے جب اس کی کمیت وکیفیت میں اضافہ اور اسے تمام حدود وشروط کے ساتھ عمدگی وخوبی سے ادا کیا جائے۔ کمیت وکیفیت میں اضافہ اور ادائیگی میں حسن و جمال اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک سلطانِ کائنات کی عظمت وجلال کا احساس تازہ نہ ہو اور بندگی کرتے ہوئے غلام یہ محسوس نہ کرے کہ اس کا مالک وآقا اس کی نگاہوں کے سامنے ہے، یا کم سے کم یہ کہ آقا اسے دیکھ رہا ہے۔ اس مشاہدے ومراقبے کے بغیر بندگی میں لطف ولذت، تازگی ورونق اور بہجت وطلعت پیدا نہیں ہوتی۔ نبی ﷺ نے حضرت جبریل کو جواب دیتے ہوئے احسان کی جو تفسیر فرمائی ہے اس سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے:

هُوَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ کَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ (بخاری ومسلم)

''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو جیسے اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔''

احسان کی وسعت

احسان کا تعلق خود اپنے نفس کے حقوق، بندوں کے حقوق، دیگر مخلوقات کے حقوق اور اللہ

کے حقوق کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور ان تمام حقوق کی ادائیگی میں ہمیں احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ احسان کا حکم کہیں عدل سے زائد تبرع اور نفل کی حیثیت رکھتا ہے اور کہیں عینِ عدل اور ایسا فرض و واجب قرار پاتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی گناہ بن جاتی ہے۔ احسان کی وسعت کا اندازہ نبی ﷺ کی درج ذیل احادیث سے ہوتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْاِحْسَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ فَاِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَۃَ وَاِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَۃَ وَ لْیُحِدَّ اَحَدُکُمْ شَفْرَتَہٗ وَلْیُرِحْ ذَبِیْحَتَہٗ (مسلم، ترمذی)

''اللہ نے انسانوں پر ضروری قرار دیا ہے کہ وہ ہر شے کے ساتھ احسان کریں۔ تو جب تم (حکم الٰہی کے ماتحت) قتل کرو تو بہ طریق احسن قتل کرو اور جب تم (کسی جانور کو) ذبح کرو تو بہ طریق احسن ذبح کرو۔ تم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی چھری تیز کر لے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے۔''

یہ حدیث ان احادیث میں شمار کی جاتی ہے جنھیں 'جوامع' کا درجہ حاصل ہے، یعنی ایسی احادیث جو اپنی بلاغت و جامعیت اور ایجاز و اختصار کے لحاظ سے دریا بکوزہ کے نمونے اور بہترین پارہ ہائے ادب ہیں۔ اس کا پہلا ٹکڑا ''اللہ نے انسانوں پر ضروری قرار دیا ہے کہ وہ ہر شے کے ساتھ احسان کریں'' ایک کلّی قانون ہے، جس نے احسان کی حدوں کو بے حد وسیع کر دیا ہے اور اس کے دائرے میں جاندار ہی نہیں، مردے تک داخل ہو گئے ہیں۔

باقی دو ٹکڑے اس قانون کلّی کی دو مثالیں ہیں اور احسان کی اہمیت و حقیقت سمجھانے کے لیے بہترین مثالیں ہیں۔ ''جب تم قتل کرو تو بہ طریقِ احسن قتل کرو۔'' اس ٹکڑے نے حدود و قصاص اور حرب و ضرب کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا ہے۔ اس کو پوری طرح سمجھنے کے لیے جاہلیت عرب کی جنگی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ 'حرب' کا لفظ عرب میں قتل و غارت، سلب ونہب، بے عزتی و رسوائی، بہیمیت و سنگ دلی اور جان و مال، عزت و آبرو کی تباہی اور بربادی کی ایک ایسی علامت تھا کہ اس کا اعلان سن کر جوان ہی نہیں بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی لرز اٹھتی تھیں، کوئی سنگ دلی اور حیوانیت ایسی نہ تھی جو جنگ میں جائز نہ سمجھی جاتی ہو۔ غدر، عہد شکنی اور بے وفائی جنگ کے لوازم میں داخل تھی، بے دریغ قتل اس کی خصوصیت تھی، بچے ہوں، بوڑھے ہوں، قاصد و پیام رساں ہوں، عورتیں ہوں، غلام اور نوکر ہوں، غرض کوئی بھی ہو، عرب جنگ جو کی تیغ تیز سے بچ نہیں سکتا تھا۔ یہ سب کے سب نذر تیغ بے دریغ ہو جاتے تھے۔ دشمنوں کو زندہ

جلا دینا، ان کو باندھ کر تیروں، نیزوں اور خنجروں کا نشانہ بنانا، ناک، کان اور دوسرے اعضاء کاٹ کر مثلہ کرنا قابلِ فخر کارنامے تھے۔ دشمنوں کے کٹے ہوئے ناک کان کو ہار بنا کر گلے میں پہننا جواں مردوں کا زیور تھا، بلکہ لاشوں کا مثلہ کرنے میں عورتیں بھی مردوں سے کم نہ تھیں۔ حضرت حمزہؓ کا مثلہ ایک عورت ہی نے کیا تھا۔ یہ حالت تھی کہ داعیِ اسلام، رسول امن وسلام محمد عربی ﷺ نے فرمایا: ''جب تم قتل کرو تو بہ طریق احسن قتل کرو'' ان مختصر جملوں نے درندگی و بہیمیت کے اس شیطانی دروازے کو ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ اس مفہوم کی دوسری حدیث ہے:

عبد اللّٰه بن یزید عن النبیﷺ اَنَّهٗ نَهٰی عَنِ النَّهْبَةِ وَالْمُثْلَةِ (بخاری، کتاب الصید)

''عبداللہ بن یزید سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے نہبہ (لوٹ) اور مثلہ سے منع فرمایا ہے۔''

کَانَ یَحُثُّنَا عَلَی الصَّدَقَةِ وَ یَنْهَانَا عَنِ الْمُثْلَةِ (ابوداؤد، کتاب الجہاد)

''نبی ﷺ ہمیں صدقہ کی ترغیب دیتے تھے اور مثلہ (انسان کے اعضا کو کاٹنا) سے منع فرماتے تھے۔''

ایک اور حدیث ہے:

اَعَفُّ النَّاسِ قِتْلَةً اَهْلُ الْاِیْمَانِ (ابوداؤد، کتاب الجہاد)

''قتل میں درندگی سے سب سے زیادہ بچنے والے اہل ایمان ہیں۔''

آگ میں جلانے کی بھی ممانعت کی:

لَا یَنْبَغِیْ اَنْ یُّعَذِّبَ بِالنَّارِ اِلَّا رَبُّ النَّارِ (ابوداؤد)

''رب النار (خدا) کے سوا کسی کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو آگ کا عذاب دے۔''

باندھ کر قتل کرنے کی بھی ممانعت کی:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِﷺ اَنْ یُّتَّخَذَ شَیْءٌ فِیْهِ الرُّوْحُ غَرْضاً (ترمذی، ابواب الصید)

''ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہر ایسی شے کو باندھ کر ہدف بنانے سے روکا ہے جس میں روح ہو۔''

ابن عمر قال سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِﷺ یَنْهٰی اَنْ تُصْبَرَ بَهِیْمَةٌ اَوْ غَیْرُهَا لِلْقَتْلِ۔ (بخاری)

''ابن عمرؓ کہتے ہیں: میں نے سنا ہے کہ نبی ﷺ جانور یا کسی دوسرے جاندار کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرماتے تھے۔''

ابوداؤد، کتاب الجہاد میں ذیل کا واقعہ درج ہے:

> ہم خالد بن الولید کے بیٹے عبدالرحمٰن کے ساتھ ایک غزوے میں شریک ہوئے تو دشمن کافروں میں سے چار گرفتار کر کے لائے گئے۔ عبدالرحمٰن کے حکم سے وہ چاروں باندھ کر قتل کر دیے گئے۔ یہ خبر ابوایوب انصاریؓ کو پہنچی تو انہوں نے کہا: میں نے نبی ﷺ کو باندھ کر قتل کرنے سے روکتے ہوئے سنا ہے۔ خدا کی قسم، اگر مرغی بھی ہوتی تو میں اس کا باندھ کر قتل نہ کرتا۔ جب ان کی یہ حدیث عبدالرحمٰن تک پہنچی تو انہوں نے اس غلطی کے کفارے میں چار غلام آزاد کیے۔"

قصاص لینا ہو یا حد لگانی ہو یا میدان جنگ میں خدا کے حکم سے انسانیت کے دشمنوں کو قتل کرنا ہو، ہر موقع پر یہ احادیث درندگی کے مقابلے میں ایک آہنی دیوار بن کر آ کھڑی ہوتی ہیں اور کوئی مومن متقی اس کی جرأت نہیں کر سکتا کہ خدا کے دشمنوں اور واجب القتل مجرموں تک کو قتل کرنے میں "بہ طریقِ احسن قتل" کی حدود سے تجاوز کرے اور مثلہ یا اذیتیں دے کر قتل کرنے کی صورتیں اختیار کر سکے۔ یہ بات اس احسان کے خلاف ہوگی جس کا حکم خدا اور رسول نے دیا ہے۔ اس حدیث کا تیسرا ٹکڑا یہ ہے۔ "اور جب تم کسی جانور کو ذبح کرو تو بہ طریق احسن ذبح کرو۔" یہ حکم فی الواقع محض ذبحِ حیوان سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ یہ احسان کا وہ شاندار درس ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مومن کو اس دنیا میں کتنی نرمی و لینت اور کس قدر مہربانی و شفقت کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جو دین اس بات کو جائز نہیں رکھتا کہ جانوروں کو ذبح کرنے میں سنگ دلی کا ثبوت دیا جائے وہ بنی نوعِ انسان کے ساتھ سنگ دلی کو کیسے جائز رکھ سکتا ہے۔ حدیث کے چوتھے جملے میں "چھری کو تیز کرنے" کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ گلا آسانی سے کٹ جائے اور جانور زیادہ اذیت محسوس نہ کرے۔ پانچویں جملے کا مطلب یہ ہے کہ کھال کھینچنے اور اعضاء کی قطع و برید میں جانور کے ٹھنڈا و ساکن ہونے کا انتظار کیا جائے۔ جب تک وہ تڑپ رہا ہو، اس کی کھال نہ کھینچی جائے۔ اس حدیث کی تائید میں دوسری حدیثیں بھی موجود ہیں:

> ہشام بن زید کہتے ہیں کہ انس بن مالکؓ کے ساتھ حکم بن ایوب (حجاج بن یوسف کے چچا) کے یہاں گیا۔ وہاں انہوں نے چند نوجوانوں کو دیکھا کہ ایک مرغی کو باندھ کر اس پر تیر اندازی کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت انس نے کہا: "نبی ﷺ نے جانوروں کو باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔"
> (بخاری، کتاب الصید)

اسی طرح ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے سامنے بھی ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ ایسا

کرنے والے پر نبی ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ (مسلم) انہی سے یہ بھی مروی ہے کہ جانوروں کا مثلہ کرنے والوں پر بھی حضورؐ نے لعنت فرمائی ہے۔ یہ حدیثیں اس ظلم کا سدباب کرتی ہیں جو عرب ایامِ جاہلیت میں جانوروں پر کیا کرتے تھے۔ وہ جانوروں کو باندھ کر نشانہ بازی کی مشق بھی کرتے تھے اور زندہ اونٹوں کے کوہان کاٹ کر کھاتے بھی تھے۔ نبی ﷺ نے ایسے گوشت کو جو زندہ جانور کے جسم سے کاٹ لیا گیا ہو، مردار اور حرام قرار دیا (ابوداؤد، ترمذی) اور جانوروں کے ساتھ احسان کا حکم نافذ فرمایا۔ سابق ظلم کے مقابلے میں یہ احسان اتنا وسیع ہوا کہ جانور کے سامنے چھری تیز کرنے کی بھی ممانعت فرمائی۔ ایک بار آپ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، دیکھا کہ ایک شخص بکری کے گال پر قدم رکھے ہوئے چھری تیز کر رہا ہے اور بکری اسے دیکھ رہی ہے۔ آپ نے فرمایا: تم نے چھری پہلے ہی کیوں نہ تیز کر لی۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اس کو دو موتوں کا مزا چکھاؤ۔ (مستدرک حاکم)

جانوروں پر احسان کا اجر

جانوروں پر مہربانی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ مسلمانوں کے لیے محض انسانیت کا تقاضا نہیں ہے، بلکہ دینی و شرعی حکم ہے، جس کی تعمیل پر ثواب اور خلاف ورزی پر عذاب لازم آتا ہے، اوپر گزر چکا کہ جانوروں پر احسان نہ کرنے والوں اور ان پر ظلم کرنے والوں پر رسولِ خداؐ نے لعنت فرمائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جانوروں پر ظلم بھی گناہ کبیرہ ہے، کیوں کہ کم درجے کے گناہ پر رسولِ خداؐ لعنت نہیں فرماتے۔ یہاں اجر سے متعلق چند حدیثیں درج کی جا رہی ہیں۔

> ''ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک شخص کہیں جا رہا تھا اور اسے سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ راستے میں اسے ایک کنواں ملا۔ وہ اس میں اترا اور پانی پی کر باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت سے زبان منہ سے باہر نکال رہا ہے اور گیلی مٹی کھا رہا ہے۔ اس نے دل میں کہا: اس کو بھی ویسی ہی پیاس لگی ہے جیسی مجھے لگی تھی۔ وہ پھر کنویں میں اترا، اپنے جوتے میں پانی بھرا، پھر اس کو منہ سے پکڑ کر باہر نکلا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ نے اس کو اس کی جزا دی اور اس کو بخش دیا۔ صحابہ نے کہا یا: رسول اللہ! کیا جانوروں میں (یعنی ان کو پانی پلانے اور ان پر احسان کرنے میں) ہمارے لیے اجر ہے؟'' آپ نے فرمایا: ہر جاندار میں (یعنی ان پر احسان کرنے میں) اجر ہے۔'' (بخاری، باب رحمۃ الناس والبھائم)

قیامت میں کسی بندے کا بخش دیا جانا سب سے بڑا اجر ہے، جو کسی عملِ خیر کا ہو سکتا ہے اور

یہ حدیثِ صحیح بتاتی ہے کہ ایک کتے پر احسان کرنے کے سلسلے میں ایک بندہ بخش دیا گیا۔ اس سے جانوروں پر احسان کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے عمل خیر سے بھی مومن کو بے پروانہ ہونا چاہیے، پتہ نہیں کون سا عملِ خیر خدائے بے نیاز کی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ حاصل کرلے، خبر نہیں، کس نیکی سے مالک خوش ہو جائے اور اپنے غلام پر نگاہ کرم ڈال دے۔ مومن سارے پاپڑ اسی لیے تو بیلتا ہے کہ اس کا آقا، اس کا رب اور اس کا مالک اس سے خوش ہو۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضورؐ سے کہا: یارسول اللہ! میں بکری کو رحم دلی کے ساتھ ذبح کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اگر تم بکری پر رحم کرو گے تو اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔ (بیہقی فی شعب الایمان) ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا: جو شخص ایک گوریا پر بھی رحم کرے گا اللہ قیامت میں اس پر رحم فرمائے گا۔ (جامع الاحادیث للسیوطی)

ان احادیث سے بہ آسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب جانوروں پر رحم اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی یہ اہمیت اور اس کا یہ اجر ہے تو انسانوں پر رحم اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی کیا اہمیت اور اس کا کیا اجر ہوگا۔ میں نے اس سلسلے کی احادیث تھوڑی تفصیل سے اس لیے پیش کیں کہ جاہلیت کی سنگ دلی پھر لوٹ آئی ہے اور ضرورت ہے کہ یہ احادیث بار بار لوگوں کے سامنے لائی جائیں۔ آج حال یہ ہے کہ خود مسلمان بھی جانور ہی نہیں، اپنے جیسے دوسرے انسانوں، بلکہ اپنے بزرگوں، عزیزوں اور جگر پاروں کے ساتھ سنگ دلی و درندگی کا وہ برتاؤ کر رہے ہیں کہ واقعات سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیتوں میں احسان کی تفصیل

سورۂ نحل کی آیتِ زیرِ بحث میں اس کا کلی و اجمالی حکم دیا گیا ہے اور پھر حسب دستور قرآن کی دوسری آیتوں میں متعدد جہتوں سے احسان کی تفصیلات ملتی ہیں۔ کہیں احسان کی نوعیتیں اور اقسام بیان کیے گئے ہیں اور کہیں محسنین کی صفات کے ضمن میں اس کی تشریح کی گئی ہے اور کہیں یہ واضح کیا گیا ہے کہ احسان کے مستحق کون لوگ ہیں؟ ہمیں کن لوگوں کے ساتھ احسان کرنا چاہیے؟ یہاں چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔

ماں باپ کے ساتھ احسان

اگرچہ ایتاء ذی القربیٰ اور صلہ رحمی کے ضمن میں (جس کا بیان آگے آئے گا) والدین سب سے پہلے داخل ہیں، اس لیے اس کی تفصیل وہیں ہونی چاہیے تھی، لیکن قرآن میں متعدد مقامات پر والدین کے ساتھ احسان کی خاص تاکید کی گئی ہے اور متعدد آیتوں میں ان کے لیے حسن اور احسان کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس لیے یہیں اس کا ذکر مناسب معلوم ہوا۔ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے جو عہد لیا تھا اس کی دوسری شق ماں باپ کے ساتھ احسان کی تھی:

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (البقرۃ:۸۳)

''یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرنا۔''

''وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (النسآء:۳۶)

''اور تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو۔''

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَیْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَیْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (الانعام:۱۵۱)

''کہہ دو، آؤ میں سنادوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے کہ اس کے ساتھ شریک نہ کرو کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔''

وَ قَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ وَ بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (بنی اسرائیل:۲۳)

''اور فیصلہ کر چکا تیرا رب کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو۔''

وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حُسْنًا (العنکبوت:۸)

''اور ہم نے تاکید کر دی انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی۔''

وَ وَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ اِحْسَانًا (الاحقاف:۱۵)

''اور ہم نے حکم دیا انسان کو ماں باپ سے بھلائی کا۔''

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰی وَهْنٍ وَّ فِصَالُهٗ فِیْ

عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ط اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○ (لقمان:۱۴)

''اور ہم نے انسان کو تاکید کی اس کے ماں باپ کے واسطے۔ اس کی ماں نے تھک کر اس کو اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہے کہ شکر گزار ہو میرا اور اپنے ماں باپ کا۔ آخر مجھی تک آنا ہے۔''

ان آیتوں سے چند باتیں وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں:

۱- اللہ تعالیٰ نے اپنے بعد انسانوں کے حقوق میں سب سے مقدم والدین کے حق کو رکھا ہے اور یہ بات عین تقاضائے فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا خالق ہے، لیکن والدین اپنی اولاد کی تخلیق اور ان کو پردۂ عدم سے عالمِ وجود میں لانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لیے خالق حقیقی کے بعد سب سے زیادہ حق انہی کا ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا رب اور اس کا پالن ہار ہے، لیکن والدین اپنی اولاد کی تربیت ونشو ونما کا وسیلہ بنتے ہیں، اس لیے رب حقیقی کے بعد اولاد پر سب سے زیادہ حقوق انہی کے ہونے چاہئیں۔

۲- دنیاوی معاملات میں بھی کسی معمولی چیز کے لیے مضبوط، مستحکم اور پختہ عہد و پیمان کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ یہ صورت وہیں پیش آتی ہے جہاں معاملہ اہم ہو۔ اسی سے اندازہ کرنا چاہیے کہ اللہ جو کائنات کا شہنشاہ اور سب سے بے نیاز ہے، جب کسی چیز پر پختہ عہد لے گا تو وہ چیز کتنی اہم ہوگی۔ بنی اسرائیل جو اس دنیا کی پہلی قوم تھی جس کو اللہ نے تمام دوسری قوموں پر شرف بخشا تھا، اس سے جو عہد لیا گیا اس کی دوسری شق والدین کے ساتھ احسان کی تھی۔

۳- یہ کچھ بنی اسرائیل کی خصوصیت نہ تھی، بلکہ عنکبوت، احقاف اور لقمان کی آیتوں نے بتا دیا کہ اس حکم میں تمام انسان شریک ہیں۔

۴- مختلف انداز بیان اور متعدد الفاظ کے ساتھ اس کا حکم دیا گیا ہے۔ کہیں میثاق کا لفظ اختیار کیا ہے، کہیں قضا کا اور کہیں وصیت کا اور یہ تینوں لفظ قرآن میں ایسے ہی مقامات پر استعمال کیے گئے ہیں جہاں معاملہ بہت اہم تھا اور سخت تاکید کی ضرورت تھی۔

تاکید کا سبب

رسولِ خداؐ کے حق کے علاوہ انسانی حقوق میں کوئی حق ایسا نہیں ہے جس کی تاکید ماں باپ

کے حق سے زیادہ کی گئی ہو۔ اس کا ایک سبب تو وہ ہے جس کا ذکر اوپر نکتہ (۱) میں کیا گیا۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ ماں باپ کی حق تلفی اور ان کے ساتھ بدسلوکی پورے معاشرے کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ خاندان کی بنیاد دو مرد و عورت کے ملاپ سے قائم ہوتی ہے۔ یہ دو انسان ایک خاندان کے بانی ہوتے ہیں اور پھر متعدد خاندانوں سے مل کر معاشرہ بنتا ہے۔ اب اگر اولاد اپنے والدین کی نافرمانی کرے، ان کے حقوق کو ٹھکرائے، ان کے ساتھ احترام، نرمی اور محبت کا برتاؤ نہ کرے تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ پورا معاشرہ بے سر کی فوج بن جائے اور حقوق کی رعایت، احترام و عزت، لینت وشفقت اور محبت والفت سے محروم ہو جائے، کیوں کہ ایک انسان جب اپنے ماں باپ کو حسن سلوک کا مستحق نہیں سمجھتا تو پھر وہ دنیا میں کسی انسان کو اس کا مستحق نہ سمجھے گا اور خود غرضی، سرکشی اور سنگ دلی کا مجسمہ بن جائے گا۔ ایسے افراد سے جو معاشرہ تیار ہوگا، وہ جیسا کچھ ہوگا، بالکل ظاہر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدائے بے نیاز نے ماں باپ کے ساتھ احسان کی جو اس قدر تاکید کی ہے، اس میں اس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہے، بلکہ یہ پختہ عہد انسانی سوسائٹی کو سنوارنے کے لیے لیا گیا ہے۔ عدل و احسان کے اوّلین مستحق ماں باپ ہیں۔ ان کے ساتھ ظلم و ناشکری کے بعد ہر عدل و احسان بے معنی ہے۔

ماں باپ کے ساتھ احسان کی تفصیل

اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ساتھ احسان کے مجمل حکم کی کچھ بنیادی تفصیل وتشریح بھی کی ہے:

اِمَّا یَبْلُغَنَّ عِنْدَکَ الْکِبَرَ اَحَدُھُمَآ اَوْ کِلٰھُمَا فَلَا تَقُلْ لَّھُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْھَرْ ھُمَا وَ قُلْ لَّھُمَا قَوْلًا کَرِیْمًا○ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَا رَبَّیٰنِیْ صَغِیْرًا○ رَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِیْ نُفُوْسِکُمْ ط اِنْ تَکُوْنُوْا صٰلِحِیْنَ فَاِنَّهٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا○ (بنی اسرائیل: ۲۳-۲۵)

''اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اف تک نہ کہو، نہ انہیں جھڑک کر جواب دو، بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی و رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ ''پروردگار ان پر رحم فرما، جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔'' تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کیا ہے۔ اگر تم صالح بن کر رہو تو وہ ایسے لوگوں کے لیے درگزر کرنے والا ہے جو اپنے قصور پر متنبہ ہو کر بندگی کے رویے کی طرف پلٹ آئیں۔''

ان آیتوں نے ماں باپ کے ساتھ احسان کا ایک خاکہ کھینچ کر سامنے رکھ دیا ہے، جس میں اولاد اپنے عمل سے رنگ بھر سکتی ہے۔ یہ والدین کے ساتھ احسان ہی کا خاکہ نہیں ہے، بلکہ اس معاشرے کا خاکہ ہے جسے اسلام تیار کرنا چاہتا ہے۔ بڑھاپے میں ماں باپ اپنی اولاد کے سب سے زیادہ محتاج ہوتے ہیں اور بڑھاپے کی وجہ سے ان کے مزاج میں خشکی بھی پیدا ہوسکتی ہے، جس کے نتیجے میں ہوسکتا ہے کہ وہ سخت کلامی پر اتر آئیں، یا جاو بے جا مطالبات کرنے لگیں، لیکن یہی وقت اولاد کی سعادت مندی کے جانچنے کا بھی ہے۔ اس آزمائش میں پورا اُترنے کے لیے جو کچھ کرنا ہے وہ یہ ہے:

۱- ان کو اُف تک نہ کہا جائے، جھڑکا نہ جائے اور ان سے ادب واحترام کے ساتھ بات کی جائے۔

۲- ان کے سامنے چھوٹا بن کر رحمت ومحبت کے ساتھ جھک کر رہا جائے۔

۳- یہ سب کچھ کرتے ہوئے بھی محسوس کیا جائے کہ ان کا حق ادا نہیں ہورہا ہے اور خدا سے ان کے لیے رحم کی دعا کی جائے۔

۴- جو کچھ کیا جائے محض دکھاوا نہ ہو، دل کے جذبے اور خلوص کے ساتھ کیا جائے۔

۵- اگر بھول چوک سے کبھی نافرمانی یا سخت کلامی ہوجائے تو متنبہ ہوکر توبہ کرلی جائے۔

''اُف تک نہ کہو'' اُف کا کلمہ کسی چیز سے بے زاری، تکلیف اور اکتاہٹ کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے دل میں جب کسی چیز سے بے زاری ونفرت پیدا ہوتی ہے تو ہماری زبان بسا اوقات کلمہ 'اف' سے اس کا اظہار واعلان کردیتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم اس چیز سے دور بھاگنا چاہتے، یا اسے اپنے سے دور کرنا چاہتے ہیں، جس سے ہمیں نفرت ہے۔ اس مفہوم کو سامنے رکھ کر دیکھئے کہ ماں باپ کو اُف کہنے کا کیا مطلب ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ بڑی سختی برتی ہے، لیکن اس کلمے کا مفہوم جاننے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی سختی نہیں ہے۔ ماں باپ، جو ہماری محبت والفت کے اولین مستحق ہیں، ان سے اگر ہم نفرت وبے زاری کا اعلان کریں، ان سے دور بھاگنا چاہیں، یا انہیں اپنے پاس سے دور کرنا چاہیں تو اس سے بڑھ کر ہماری نالائقی اور کیا ہوگی۔ قرآن نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ ماں باپ کے مقابلے میں اف کا ایک کلمہ خدا کے ایک باغی نے استعمال کیا تھا:

وَ الَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ اَتَعِدَانِنِیْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَ هُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ﳓ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ○ (الاحقاف:۱۷)

''اور جس شخص نے اپنے ماں باپ سے کہا: میں تم سے بیزار ہوں، کیا تم مجھے یہ وعدہ دیتے ہو کہ میں قبر سے نکالا جاؤں گا اور بہت سی جماعتیں مجھ سے پہلے گزر چکی ہیں۔ اور وہ دونوں اللہ سے فریاد کر رہے ہیں: تیری خرابی ہو، تو ایمان لے آ، بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ وہ جواب میں کہتا ہے: یہ سب اگلوں کی کہانیاں ہیں۔''

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کے مقابلے میں اف کہنا کسی مومن صالح کا کام نہیں ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ماں باپ جب اپنی اولاد کی اچھی تربیت چاہتے ہوں اور انہیں ایمان، تقویٰ، خیر وصلاح کی طرف بلا رہے ہوں اور ایسے موقع پر اولاد کلمہ اف سے اپنی بے زاری کا اعلان کرے تو یہ بات کفر کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے۔ والدین کے ساتھ احسان کی کچھ تفصیل ذیل کی آیت میں بھی ہے:

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ بَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَ اِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَ نَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ؕ وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ ○ (الاحقاف:۱۵، ۱۶)

''یہاں تک کہ جب وہ اپنی قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا، کہنے لگا: اے میرے رب! میری قسمت میں کر کہ میں شکر کروں تیرے احسان کا جو تو نے مجھ پر کیا اور میرے ماں باپ پر اور یہ کہ کروں نیک کام جس سے تو راضی ہو اور میری اولاد کی اصلاح فرما دے، میں نے توبہ کی تیری طرف اور میں ہوں فرماں برداروں میں سے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے ہم قبول کرتے ہیں بہتر سے بہتر کام جو کیے ہیں اور معاف کرتے ہیں ہم برائیاں ان کی، رہنے والے جنت کے لوگوں میں، سچا وعدہ جو ان سے کیا جاتا تھا۔''

پہلی آیت نے ایک مومن متقی کی عائلی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے اور دوسری آیت نے اس کی شکرگزاری اور عمل صالح کا اجر وصلہ بیان کر دیا ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان پر

صرف احسانات کا شکر واجب نہیں ہے جو اللہ نے خود اس پر کیے ہیں، بلکہ ان احسانات وانعامات کا شکر بھی واجب ہے جو اللہ نے اس کے والدین پر کیے ہیں، کیوں کہ ماں باپ کی نعمتوں میں اولاد بھی شریک ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اس کی تربیت و خیر خواہی اس کے والدین پر ضروری تھی اسی طرح اپنی اولاد کی تربیت و خیر خواہی اس پر ضروری ہے۔

ایک چالیس سالہ مسلمان جس کی عقل اور تمام علمی و عملی قوتیں پختہ ہو چکی ہیں دست بدعا ہے: ''پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھ پر کی ہیں۔ مالک! مجھے توفیق دے کہ میں ان انعامات کا بھی شکر ادا کروں جو تو نے میرے ماں باپ پر کیے ہیں۔ آقا! مجھے توفیق بخش کہ میں وہ عمل صالح کروں جس سے تو خوش ہو اور اے میرے رب! میری ذریت، میری اولاد کی بھی اصلاح فرما دے! میری ساری توجہ میرا اتمام رجوع تیری طرف ہے اور میں تیرا فرماں بردار ہوں۔''

یہ کتنا ستھرا نقشہ ہے ایک مسلم کی زندگی کا۔ اس کے لفظ لفظ سے دل کا سوز، شکر گزاری کا جذبہ، توبہ و انابت کی کیفیت اور روز جزا کی مکافات کا خیال اُبلا پڑتا ہے اور پھر اس کے بعد اس دعا اور ایسے افراد کے عمل خیر کا، مالک کی طرف سے جو جواب ہے اسے بھی ملاحظہ کیجیے: ''ہاں یہی لوگ ہیں جن کے اچھے عمل ہم قبول کرتے اور جن کی لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں، ہاں یہی لوگ جنت والے ہیں۔ یہ وہ سچا وعدہ ہے جو ایسے لوگوں سے کیا جاتا رہا ہے۔''

ماں کے ساتھ حسن سلوک کی مزید تاکید

قرآن کریم میں تو غالباً اس کی صراحت نہیں ہے کہ حسن سلوک اور برّ و نیکی میں ماں کو باپ پر تقدم حاصل ہے، لیکن اشارات موجود ہیں اور انہی اشارات کی تصریح نبی ﷺ نے فرمائی ہے۔ قرآن نے دو مقامات پر ماں کی اس زحمت کا ذکر کیا ہے جسے اولاد کے سلسلے میں تنہا وہ برداشت کرتی ہے۔ سورۂ لقمان میں کہا:

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ (آیت ۱۴)

''اس کی ماں نے تھک تھک کر اس کو اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہے۔''

سورۂ احقاف میں فرمایا:

حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَ حَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ؕ (آیت ۱۵)

''اور پیٹ میں رکھا اس کو اس کی ماں نے تکلیف سے اور جنا اس کو تکلیف سے، اس کا حمل میں رہنا اور دودھ چھوڑنا تیں مہینے میں ہے۔''

سورۂ اعراف میں ابتدائے حمل کی مدت کے بعد اس کے بوجھل ہونے کا ذکر ہے۔ غرض یہ کہ ماں ابتدائے حمل سے لے کر ولادت تک تکلیف اور خطرے کی زندگی بسر کرتی ہے۔ بچے کی ولادت کے بعد گویا اسے نئی زندگی ملتی ہے اور اسی پر مصیبت ختم نہیں ہوتی، بلکہ بچہ جب تک سن شعور کو نہ پہنچ جائے اس کی زحمت و تکلیف کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اس زحمت و تکلیف کا تقاضا ہے کہ حسنِ سلوک و اطاعت میں اس کو باپ پر تقدم حاصل ہو۔ نبی ﷺ نے اس کی تصریح فرمائی ہے:

''حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے، ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: یارسول اللہ! میرے حسن صحبت و حسن سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے کہا: پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔ کہا پھر کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ کہا پھر کون؟ فرمایا: تیرا باپ۔'' (متفق علیہ)

اس اعلیٰ درجے کی حدیث کی بنا پر جمہور علماء کی رائے میں ماں کو باپ پر اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ اس کا ایک سبب تو وہی ہے کہ وہ ابتدائے حمل سے بچے کے سن شعور تک بے حد مشقتیں برداشت کرتی ہیں۔ اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ عموماً اولاد باپ کے مقابلے میں ماں سے زیادہ گستاخ اور اس کی نافرمانی اور ایذا رسانی پر جری ہوتی ہے۔ باپ کے مقابلے میں بیٹا زیادہ گستاخ و نافرمان اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ اسے ماں سے زیادہ قوی بھی پاتا ہے اور یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کے سارے اخراجات باپ برداشت کر رہا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر گستاخی کروں گا تو باپ سزا بھی دے گا اور اخراجات بھی بند کر دے گا۔ وہ اپنے ماضی کو بھول جاتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ ماں نے اس کو جنم دینے اور اس کو سن شعور تک پہنچانے میں کیا زحمتیں برداشت کی ہیں۔ وہ صرف اپنے زمانۂ حال کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ماں سے گستاخ ہونے کا ایک سبب اس کی غایت شفقت بھی ہے۔ وہ باپ سے زیادہ رقیق القلب ہوتی ہے اور بچے کی گستاخی کو اکثر نظرانداز کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی گستاخی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ وجوہ و اسباب ہیں کہ نبی ﷺ نے ماں کو باپ پر تین گنا فوقیت دی ہے۔

ماں باپ کی اطاعت کہاں نہیں ہے؟

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی اطاعت پر اتنا زور دینے سے یہ غلط فہمی ہوتی تھی کہ ان کی اطاعت بالکل مطلق ہے اور کوئی ایسا موقع نہیں آ سکتا کہ اولاد ان کی نافرمانی کی جرأت کرے۔ چناں چہ زمانۂ نزول قرآن میں ایک کافرہ ماں کو یہ غلط فہمی ہوئی تھی۔ اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے اللہ نے فرمایا:

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْناًط وَ اِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَاط اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُم بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○ (العنکبوت:۸)

"اور اگر وہ زور کریں کہ تو شریک کرے میرا جس کی تجھ کو خبر نہیں تو ان کی اطاعت نہ کر، مجھی تک تم سب کو پلٹنا ہے تو میں بتادوں گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے۔"

اس آیت نے ماں باپ کی اطاعت کو محدود کر دیا اور واضح طور پر بتا دیا کہ خدا کا حق ماں باپ کے حق سے زیادہ ہے۔ خدا اولاد کا بھی خالق و حاکم ہے اور ماں باپ کا بھی خالق و حاکم ہے۔ اس لیے جہاں اس کی نافرمانی لازم آ رہی ہو وہاں والدین کی اطاعت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بھی اس نے بتا دیا کہ آخر کار سب کو مجھی تک آنا ہے، وہاں میں کھول دوں گا کہ زیادتی کس کی تھی۔ اگر والدین اولاد سے ناجائز مطالبہ کریں اور وہ اطاعت نہ کرے تو قیامت میں والدین سے پرسش ہو گی، اولاد سے نہیں۔ اس آیت کے شان نزول میں یہ روایت آئی ہے:

مصعب بن سعد اپنے والد سعد بن وقاصؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کی ماں نے قسم کھائی: جب تک سعد دین اسلام کا انکار نہ کریں وہ ان سے بات نہ کریں گی اور کھانا پینا بھی چھوڑ دیں گی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اللہ نے تم کو ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، میں تمھاری ماں ہوں اور تمھیں حکم دیتی ہوں کہ اسلام کو چھوڑ دو۔ حضرت سعدؓ کہتے ہیں کہ وہ تین دنوں تک بے کھائے پیے رہیں، یہاں تک کہ بھوک کی شدت سے بے ہوش ہو گئیں تو ان کے دوسرے بیٹے عمارہ نے ان کو کھلایا پلایا (ایک دوسری روایت میں ہے کہ زبردستی منہ پھاڑ کر غذا ان کے حلق میں ڈالی جاتی تھی) اس کے بعد وہ اپنے بیٹے سعد کے لیے بددعا کرنے لگیں۔ تب یہ آیت وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا الخ نازل ہوئی۔ (مسلم، کتاب الفضائل)

آیت میں یہ ہے کہ اگر وہ تمہیں شرک پر مجبور کریں تو اطاعت نہ کرو۔ یہاں شرک میں خدا کی معصیت داخل ہے۔ کیوں کہ نبی ﷺ نے یہ کلّی قانون بنا دیا ہے لاَ طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ (احمد وطبرانی) "خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی کوئی اطاعت نہیں ہے۔" ضرورت تھی کہ مشرک و کافر ماں باپ کے ساتھ برتاؤ کے بارے میں کوئی واضح حکم آتا۔ یہ ضرورت سورۂ لقمان کی آیت ذیل نے پوری کر دی۔

وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّ اتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (لقمان:۱۵)

"اور اگر وہ دونوں اڑ جائیں اس بات پر کہ تو میرا شریک مان اس چیز کو جس کی تجھے خبر نہیں تو ان کا کہنا نہ مان اور دنیا میں نیکی و دستور کے موافق ان کا ساتھ دے اور اس کی راہ چل جو میری طرف رجوع ہوا، پھر میری طرف تم کو پلٹنا ہے، وہاں میں بتا دوں گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے۔"

اس آیت نے کچھ اور وضاحت سے بتایا کہ جہاں تک دینی و اخروی معاملات کا تعلق ہے، پیروی خدا کے رسولوں اور مخلص بندوں کی ہوگی، دین کے خلاف کسی کی بات نہیں مانی جائے گی۔ ہاں دنیا میں دستور کے موافق ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے گا۔ یعنی ان کا ادب و احترام ملحوظ رکھا جائے گا اور ضرورت ہو تو ان کی کفالت کی جائے گی، ان کو مالی مدد دی جائے گی، ان کو خدمت کی ضرورت ہو تو خدمت کی جائے گی۔

"اسماء بنت ابی بکرؓ سے مروی ہے کہ میرے یہاں میری مشرکہ ماں آئیں تو میں نے نبی ﷺ سے پوچھا کہ میری ماں آئی ہیں اور وہ دین اسلام سے بے زار ہیں۔ کیا میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ نے فرمایا: ہاں اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو۔" (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث

اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث بہت مفصل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرک ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک و خیر خواہی اور ادب و احترام کس طرح ہونا چاہیے:

"حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ میری ماں مشرکہ تھیں اور میں ان کو اسلام کی طرف دعوت دیا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے ان کو اسلام کی طرف دعوت دی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں

ایسی باتیں کہیں جو مجھے سخت ناگوار گزریں۔ میں روتا ہوا حضورؐ کے پاس پہنچا۔ میں نے کہا: یارسول اللہ! میں اپنی ماں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کیا کرتا تھا اور وہ انکار کرتی تھیں۔ آج بھی میں نے ان کو اسلام کی طرف بلایا تو انہوں نے آپ کی شان میں ایسی باتیں کہیں جو مجھے ناگوار گزریں۔ آپ اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت دے۔ حضورؐ نے دعا کی: اے اللہ! ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت دے۔ میں حضورؐ کی دعا سن کر خوش خوش وہاں سے نکلا۔ جب میں گھر پہنچا تو دروازہ بند پایا۔ میری ماں نے میرے قدموں کی چاپ سنی تو کہا: اے ابو ہریرہ! تھوڑی دیر کرلو۔ میں نے پانی گرنے کی آواز سنی۔ وہ غسل کر رہی تھیں۔ انہوں نے غسل کیا، قمیص پہنی اور جلدی میں دوپٹہ اوڑھے بغیر آکر دروازہ کھولا، پھر کہا: ''اے ابو ہریرہ! اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و اشھد ان محمدًا عبدہ و رسولہ۔ اس کے بعد میں خوشی کے آنسو بہاتا رسولِ خداؐ کے پاس گیا اور کہا: یارسول اللہ! بشارت ہو، اللہ نے آپ کی دعا قبول فرمالی اور ابو ہریرہ کی ماں کو ہدایت بخشی۔ یہ سن کر آپ نے اللہ کی حمد و ثنا کی اور چند کلماتِ خیر ارشاد فرمائے۔ اس کے بعد میں نے کہا: یارسول اللہ! دعا فرمایئے کہ اللہ مجھے اور میری ماں کو مومنوں کا محبوب بنادے اور انہیں ہم دونوں کا محبوب بنادے۔ آپ نے دعا کی: اے اللہ! اپنے اس بندے ابو ہریرہ اور اس کی ماں کی محبت اپنے مومن بندوں کے دل میں ڈال دے اور ان دونوں کے دل میں اپنے مومن بندوں کی محبت ڈال دے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ اس کے بعد جس مومن نے میرا ذکر سنا یا مجھے دیکھا اس نے مجھ سے محبت کی۔'' (مسلم، کتاب الفضائل)

اس حدیث سے بہت سے باتیں مستنبط ہوتی ہیں، لیکن یہاں ان سب کا ذکر غیر ضروری ہے۔ مشرک ماں باپ کے ساتھ مومن اولاد کا برتاؤ کیسا ہونا چاہیے اس کا ایک واضح نقشہ اس میں موجود ہے اور اس قیاس پر مومن ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ طریقِ دعوت دین کے سلسلے میں بھی اس حدیث کے اندر واضح رہنمائی موجود ہے۔

والدین کے ساتھ نیکی کا ذکر احادیث میں

برّ الوالدین یعنی ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک، ان کی اطاعت اور ان کے حقوق کے بارے میں متعدد احادیث، حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن ان سب کو یہاں پیش کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔ صرف ایک اعلیٰ درجہ کی حدیث، جسے امام بخاری، امام مسلم اور دوسرے محدثین نے روایت کیا ہے، یہاں پیش کی جاتی ہے۔ یہ الفاظ امام بخاری کی روایت کردہ حدیث کے ہیں:

عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَأَلْتُ النَّبِیَّ ﷺ اَیُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَی اللّٰهِ قَالَ اَلصَّلٰوةُ عَلٰی وَقْتِهَا قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ ثُمَّ بِرُّ الْوَالِدَیْنِ قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ اَلْجِهَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِیْ بِهِنَّ وَ لَوِ اسْتَزَدْتُهٗ لَزَادَ۔

(بخاری، کتاب الادب)

''عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے پوچھا: اللہ کے نزدیک کون سا عمل سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ آپ نے فرمایا: نماز کو وقت پر ادا کرنا۔ ابن مسعود نے کہا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: پھر ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔ کہا: پھر کون سا؟ فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے یہ باتیں مجھے بتائیں اور اگر میں اور سوال کرتا تو آپ جواب دیتے۔''

بِرّ کا لفظ عربی زبان میں وسیع معانی رکھتا ہے۔ برالوالدین میں حسن سلوک، جائز امور میں ان کی اطاعت اور ان کے حقوق کی ادائیگی سب کچھ داخل ہے۔ اس حدیث میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حق کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد ماں باپ کے حق کا۔ یہ وہی ترتیب ہے جو اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات میں اختیار کی ہے، جیسا کہ مفصل گزر چکا۔ چناں چہ بعض علماء نے اس حدیث کو آیت اَنِ اشْکُرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ کی شرح قرار دیا ہے۔ یہاں جس جہاد کو درجے میں برّالوالدین کے بعد رکھا ہے، محدثین فرماتے ہیں کہ وہ نفلی جہاد ہے۔ اس حدیث کی تشریح ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے:

حضرت عبداللہ عمرو بن العاصؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میں جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا: کیا تمہارے ماں باپ زندہ ہیں؟ اس نے کہا: ''ہاں زندہ ہیں۔'' آپ نے فرمایا: انہی میں (یعنی ان کی خدمت اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں) جہاد کرو۔ (بخاری، کتاب الادب)

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ جہاد کا لفظ صرف قتال کے معنی میں نہیں آتا، بلکہ امورِ خیر میں جدوجہد اور سعی وکوشش کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نفلی واختیاری قتال فی سبیل اللہ اسی وقت صحیح ہے جب ماں باپ خدمت کے محتاج نہ ہوں اور وہ اس کی اجازت دیں۔

عقوقِ والدین گناہِ کبیرہ ہے

جس طرح لفظ بِر میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور جائز امور میں ان کی اطاعت اور

ان کے حقوق کی ادائیگی داخل ہے، اسی طرح عقوق کے لفظ میں ان کے ساتھ بدسلوکی، جائز امور میں ان کی نافرمانی اور ان کے حقوق کی عدم ادائیگی داخل ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِاَکْبَرِ الْکَبَائِرِ قُلْنَا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰهِ وَ عُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ (صحیح بخاری، کتاب الادب)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تمھیں بہت بڑے گناہوں سے خبردار نہ کروں۔ ہم نے کہا: ہاں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا اور ماں باپ کی نافرمانی وایذارسانی۔''

ایک اور حدیث میں فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّهَاتِ (بخاری ومسلم)

''اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی وایذارسانی کو حرام قرار دیا ہے۔''

اولاد کے ساتھ حسن سلوک

اولاد پر ماں باپ کے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے واجب کیے ہیں اور ان کے ساتھ احسان کی جو تاکید کی ہے، اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ ان پر اپنی اولاد کا کوئی حق نہیں ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کے وہ پابند نہیں ہیں، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انسانی حقوق میں کوئی حق ایسا نہیں ہے جو یک طرفہ ہو۔ ایسی ذات کہ اس کا حق تمام انسانوں پر واجب ہو اور اس پر کسی کا حق واجب نہ ہو، صرف خالقِ کائنات کی ذات ہے، لیکن وہ چوں کہ کریموں کا کریم ہے، اس لیے بہت سی چیزیں اس نے بطور خود اپنے اوپر ضروری قرار دے لی ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ خود اللہ رب العالمین کا حق بھی یک طرفہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چوں کہ اولاد کی محبت ماں باپ کے دلوں میں ڈال دی ہے، اس لیے وہ طبعاً بھی محبت وشفقت اور حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہیں، لیکن یہاں گفتگو اس حق واحسان کی ہے جسے شریعت نے ضروری قرار دیا ہے۔

قتل اولاد کی ممانعت

زمانۂ جاہلیت میں اولاد کے بارے میں کئی طرح کے غلط خیالات پائے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک خیال یہ پایا جاتا تھا کہ بیٹے خاندان کی عزت ووقار کا سبب ہیں اور بیٹیاں ننگ وعار کا۔ چناں چہ بعض قبیلے اسی ننگ وعار کے اندیشے سے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ دوسرا

خیال یہ تھا کہ ماں باپ اپنے آپ کو اولاد کا روزی رساں تصور کرتے تھے۔ اس غلط خیال کی بنا پر انہیں اگر فقر و احتیاج کا اندیشہ ہوتا تو اولاد کو قتل کر دیتے تھے۔ فی الواقع یہ دونوں خیال اس عقیدے کی فرع تھے کہ وہ اپنے آپ کو اولاد کا مالک سمجھتے تھے۔ ان کی اپنی طبیعت کے حکم کے سوا وہاں کسی دوسرے کا کوئی حکم نہ تھا جو ان کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ طبیعت چاہی تو اولاد کو سر پر بٹھا لیا اور طبیعت چاہی تو بے دردی سے اسے قتل کر دیا۔ قرآن نے ان کے خیالات کی اصل و فرع دونوں کی اصلاح کی۔ اس نے انہیں تعلیم دی کہ تم اپنی اولاد کے نہ مالک ہو نہ رازق اور عزت و ذلت کا وہ معیار غلط ہے جو تم نے اپنی طبیعت سے گھڑ لیا ہے۔ اللہ تمام کائنات کا خالق بھی ہے، مالک بھی ہے۔ اور روزی رساں بھی ہے اور اسی کو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ عزت و ذلت کا صحیح معیار تمہیں بتائے۔ اولاد تمہارے پاس خدا کی امانت ہے، بلکہ خود تمہاری اپنی جان بھی اسی کی امانت ہے۔ تم نہ اپنی جان کے مالک ہو اور نہ اولاد کی جان تمہاری ملکیت میں ہے:

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ ۚ (الانعام:۱۵۱)

”اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔“

کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص فی الحال مفلس ہوتا تھا، اس کے پاس اتنی روزی نہیں ہوتی تھی کہ خود بھی کھائے اور بچوں کو بھی کھلائے، اپنے نفس کی محبت اس پر اتنی غالب ہوتی تھی کہ اسے آسودہ کرنے کے لیے وہ اولاد کو قتل کر دیتا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ایک اور صورتِ حال کا اس طرح ذکر کیا ہے:

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل:۳۱)

”اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ ہم انہیں بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی۔ بلاشبہ ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔“

یہ آئندہ مفلس ہو جانے کے اندیشے سے قتلِ اولاد کی ممانعت ہے۔ آج کل خاندانی منصوبہ بندی اور ضبط ولادت کی جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ اسی اندیشے کا نتیجہ ہے۔ مولانا مودودیؒ تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

''یہ آیت ان معاشی بنیادوں کو قطعی منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں ضبط ولادت کی تحریک اٹھتی رہی ہے۔ افلاس کا خوف قدیم زمانے سے آج تک قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہوا کرتا تھا اور آج وہ ایک تیسری تدبیر یعنی منعِ حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے، لیکن منشور اسلامی کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر ان تعمیری مساعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے جن سے اللہ کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے۔ اس دفعہ کی رو سے یہ بات انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ بار بار معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزائشِ نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہوسکتا ہے۔ یہ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ اس خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین پر بسایا ہے۔ جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتا رہا ہے، بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔ تاریخ کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے اتنے ہی بلکہ بارہا اس سے بہت زیادہ معاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں۔ لہٰذا خدا کے تخلیقی انتظامات میں انسان کی بے جا دخل اندازیاں حماقت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔''

(تفہیم القرآن ج ۲، ص ۶۱۴)

سورۂ انعام اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیتوں نے مل کر ہر صورت حال میں قتل اولاد سے روک دیا۔ مسلمانوں کے دل و دماغ میں اللہ کی رزّاقیت کا عقیدہ اتنی مضبوطی کے ساتھ جما رہا کہ تیرہ سو برس تک اندیشۂ فقر و افلاس کی بنا پر قتل اولاد کی کوئی تحریک تو کیا اٹھتی، شاید اس طرح کے قتل کی دو چار انفرادی مثالیں بھی مشکل ہی سے ملیں گی، لیکن آج بعض مسلمان حکومتیں بھی مغرب کی اندھی تقلید میں ضبط ولادت اور خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کو طاقت کے بل پر نافذ کرنے کی سعی میں مشغول ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود شریعت اسلامیہ سے اس کے جواز کی سندیں ڈھونڈی جا رہی ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ مذہب کو آگے بڑھ کر اس میں مدد کرنی چاہیے۔ گویا مذہب کرایہ کا ٹٹو ہے اور اسے ادھر ہی چلنا چاہیے جدھر آپ چلانا چاہتے ہیں۔ اس معاملہ میں سب سے زیادہ رخصتِ عزل کی حدیث کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

رخصتِ عزل سے غلط استدلال

جو لوگ رخصتِ عزل کی احادیث سے برتھ کنٹرول کی تحریک یا خاندانی منصوبہ بندی پر

استدلال کرتے ہیں وہ ایک بڑی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ غذا کی کمی اور ذرائع کی تنگی کے اندیشے کی بنا پر اگر عزل کی رخصت ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نعوذ باللہ رخصتِ عزل کی احادیث نے خدا کی رزق رسانی کے عقیدے کو مجروح کر دیا۔ قرآن میں قتل اولاد کی ممانعت جن آیتوں میں ہے ان کی بنیاد ہی اللہ نے نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ (ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی دیں گے) پر رکھی ہے۔ اب اگر اندیشۂ فقر و احتیاج کی بنا پر عزل کرنا صحیح ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کی رزّاقیت کا عقیدہ ختم ہوا اور وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی جس پر قتل اولاد کی ممانعت قائم کی گئی تھی۔ اصل میں یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ رخصتِ عزل کے پس منظر کو ذہن سے نکال کر گفتگو کی جاتی ہے۔ کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس میں اندیشۂ فقر و احتیاج کی بنا پر پیدائشِ اولاد کو روکنے کی کراہتہً بھی اجازت دی گئی ہو اور یہ ممکن کیسے تھا کہ نبی ﷺ کسی ایسی چیز کی اجازت دیتے جس سے خدا کی رزق رسانی کے عقیدے پر حرف آتا۔ یہاں میں چند احادیث نقل کرتا ہوں جس سے رخصتِ عزل کا پس منظر واضح ہو گا۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے:

قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ غَزْوَةً بِالْمُصْطَلَقِ فَسَبَيْنَا كَرَائِمَ الْعَرَبِ فَطَالَتْ عَلَيْنَا الْعُزُوْبَةُ وَ رَغِبْنَا فِي الْفِدَاءِ فَاَرَدْنَا اَنْ نَّسْتَمْتِعَ وَ نَعْزِلَ فَقُلْنَا نَفْعَلُ وَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَيْنَ اَظْهُرِنَا لَا نَسْاَلُهُ فَسَاَلْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لَا عَلَيْكُمْ اِلَّا تَفْعَلُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ خَلْقَ نَسْمَةٍ كَانَتْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِلَّا سَتَكُوْنُ. (مسلم)

''ابو سعیدؓ کہتے ہیں ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بنو المصطلق کے غزوہ میں شرکت کی۔ اس غزوے میں ہم نے نفیس لونڈیاں گرفتار کیں۔ ہمیں اپنی بیویوں سے الگ رہتے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے اور ہمیں ان لونڈیوں کے دام وصول کرنے کی بھی رغبت تھی۔ ہم نے چاہا کہ ان سے فائدۂ جماع حاصل کریں اور عزل کریں، پھر ہم نے سوچا کہ ہمارے درمیان رسولِ خدا موجود ہیں، ان سے پوچھے بغیر ایسا کرنا مناسب نہیں، تو ہم نے آپ سے سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: اگر عزل نہ کرو تو تمہارا کچھ نہ بگڑے گا۔ قیامت تک جتنے انسانوں کی پیدائش اللہ نے لکھ دی ہے وہ تو پیدا ہو کر ہی رہیں گے۔''

پس منظر یہ ہوا کہ غزوۂ بنوالمصطلق میں کچھ لونڈیاں صحابۂ کرام کے حصوں میں آئیں۔ وہ عرصے سے اپنی بیویوں سے الگ تھے اور انہیں عورتوں کی شدید احتیاج تھی۔ وہ ان لونڈیوں سے تمتع چاہتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کو فروخت کر کے ان کے دام وصول کریں۔ اگر وہ حاملہ ہو جاتیں تو ام ولد (ام ولد اس لونڈی کو کہتے ہیں جس کے بطن سے آقا کا کوئی بچہ پیدا ہو) ہونے کی وجہ سے ان کا بیچنا ممنوع ہو جاتا یا ان کی قیمتِ فروخت پر اس کا اثر پڑتا۔ اس چیز سے بچنے کے لیے ان کے ذہنوں میں عزل کی تدبیر آئی اور انہوں نے اس کے بارے میں سوال کیا۔ حضورؐ نے اس فعل کو پسند نہیں فرمایا اور اسے اس مقصد کے حصول کے لیے، جس کا ذکر کیا گیا، ایک بے کار فعل قرار دیا، لیکن صراحۃً اس کی ممانعت بھی نہ کی۔ ایک اور حدیث میں ہے:

> ''ایک شخص حضورؐ کے پاس آیا اور اس نے کہا: میرے پاس ایک لونڈی ہے، وہی ہماری خادمہ بھی ہے اور وہی ہمارے لیے پینے کا پانی بھی لاتی ہے۔ میں اس سے وطی کرتا ہوں اور یہ نہیں چاہتا کہ وہ حاملہ ہو۔ تو کیا میں عزل کروں۔ آپ نے فرمایا، اگر تو چاہے تو عزل کر، لیکن اگر اس سے بچہ پیدا ہونا ہے تو ہو کر رہے گا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ پھر آیا اور اس نے کہا: یارسول اللہ! وہ حاملہ ہوگئی آپ نے فرمایا: میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جو بچہ مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا۔'' (مسلم)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے ایامِ رضاعت میں دودھ پیتے بچے کو نقصان پہنچ جانے کے اندیشے سے عزل کرنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ جس بچے کو پیدا ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ (مسلم)

ان احادیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں:

(۱) عزل کی عدم ممانعت کا اصل تعلق لونڈیوں سے ہے۔

(۲) اس کا محرک فقر واحتیاج یا کثرتِ اولاد کی وجہ سے معیارِ زندگی کے گر جانے کا اندیشہ نہ تھا۔

(۳) آپ نے عدم استقرار حمل کے لیے عزل کی تدبیر کو فعل عبث قرار دیا، کیوں کہ اس صورت میں ننانوے فی صدی اس کا احتمال باقی رہتا ہے کہ مادۂ تولید کا کوئی جرثومہ اندر رہ جائے۔ آپ نے بار بار یہ جو فرمایا ہے کہ ''جس بچے کی پیدائش اللہ نے لکھ دی ہے وہ ہو کر رہے گا۔'' وہ اسی احتمال کی بنا پر فرمایا ہے۔ اس ٹکڑے کو ایک دوسری حدیث واضح کرتی ہے:

عَنْ أَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیَّ یَقُوْلُ سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ

عَنِ الْعَزْلِ فَقَالَ مَا مِنْ کُلِّ الْمَاءِ یَکُوْنُ الْوَلَدُ وَ اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ خَلْقَ شَیْءٍ لَمْ یَمْنَعْهُ شَیْءٌ۔ (مسلم)

''ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ سے عزل کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: ہر منی سے بچہ نہیں پیدا ہوتا اور جب اللہ کسی شے کو پیدا کرنا چاہے تو کوئی شے مانع نہیں ہوتی۔''

ایک اور انداز سے آپ نے عزل کے بے فائدہ ہونے کی وضاحت کی۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ محض مادۂ تولید کا داخل ہو جانا تخلیقِ ولد کا اصل سبب نہیں ہے، بلکہ ارادۂ الٰہی اس کا اصل سبب ہے۔ کل کا کل مادہ بھی اندر پہنچ جائے اور ارادۂ الٰہی نہ ہو تو بچہ پیدا نہ ہوگا اور اگر ارادۂ الٰہی ہو تو کوئی نہ کوئی قطرہ اندر رہ جائے گا اور اس کو روکنے پر انسان قادر نہ ہوگا اور بچہ پیدا ہو کر رہے گا۔ جن ملکوں میں برتھ کنٹرول سے شرح پیدائش گر گئی وہاں اس کا سبب صرف عزل کی تدبیر نہیں، بلکہ اور دوسری تدبیریں تھیں۔ اس کا سبب مانع حمل دوائیں، بلکہ سب سے زیادہ اس کا سبب چمڑے کے غلافوں کا استعمال تھا۔ محض عزل کی تدبیر سے شرح پیدائش بہت زیادہ کبھی نہیں گر سکتی اور اب تو شیطان نے آپریشن کی تدبیر بھی سکھا دی ہے۔ بہت موقعوں پر تو عورتوں پر یہ ظلم بھی روا رکھا گیا ہے کہ آپریشن کے ذریعہ ان کے رحم ہی کو نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ اگر مغرب کے لوگ صرف عزل کی تدبیر پر قانع ہوتے تو ان کے وہ مقاصد کبھی حاصل نہ ہوتے جنہیں وہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

بنیادی فرق

تدبیرِ عزل اور منعِ حمل کی موجودہ تدابیر کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں ننانوے فی صدی استقرارِ حمل کا احتمال باقی رہتا ہے اور موجودہ تدابیر میں اس احتمال کو بالکل ختم کرنے کی سعی کی جاتی ہے، اس لیے ان تدابیر کو تدبیرِ عزل پر قیاس کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ کہ فقر و احتیاج یا معیارِ زندگی کے گر جانے کے اندیشے سے عزل کی سرے سے کوئی رخصت موجود نہیں ہے، اس لیے بھی خاندانی منصوبہ بندی کو اس پر قیاس کرنا لغو ہے۔

اگر نبی ﷺ کے سامنے صحابہ کوئی ایسی تدبیر پیش کرتے جس سے استقرارِ حمل کا احتمال بالکل ختم ہو رہا ہوتا تو آپ ہرگز اس کی اجازت نہ دیتے۔ یہ کوئی قیاسی بات نہیں ہے، بلکہ اس کی دلیل یہ ہے کہ شریعت میں اختصاء یعنی اپنے آپ کو خصی بنا لینا بالاتفاق حرام ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اپنی قوتِ رجولیت کو ختم کر لینے کی کوئی رخصت اسلامی شریعت میں موجود نہیں ہے۔ اس مسئلے کا

ایک پہلو یہ بھی ہے، جسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ عزل کی محدود رخصت بھی شریعت کا کوئی اجماعی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ علمائے امت کے ایک گروہ کے نزدیک عزل مطلقاً ناجائز ہے۔

عورتوں سے معاہدے کی ایک دفعہ

عرب میں چوں کہ اولاد کو قتل کرنے کی ظالمانہ رسم جاری تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز میں اس قبیح رسم کے استیصال کے لیے احکام نازل فرمائے۔ سورۂ ممتحنہ میں جب دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے والی مسلمان عورتوں سے بیعت (معاہدہ) کا حکم آیا تو اس کی چوتھی دفعہ یہ تھی: وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ (اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں)۔ جب تک وہ بیعت کی اس شرط کو بھی نہ مان لیں، ان سے بیعت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور یہ دفعہ بیعت کی تیسری دفعہ وَلَا يَزْنِيْنَ (اور بدکاری نہ کریں) کے بعد مذکور ہے۔ اس ترتیب سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ کبھی قتل اولاد کا سبب زنا بھی ہو سکتا ہے۔ یورپ میں برتھ کنٹرول کی تحریک جو زوروں پر چلائی گئی اس کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ اس کے ذریعہ زنا کی بدکاری آسان ہو جائے۔ چناں چہ اس تحریک کے نتیجے میں یہ بدکاری وہاں آگ کی طرح پھیل گئی۔

قتلِ اولاد کو خوش نما کون بناتا ہے؟

سورۂ انعام میں ہے:

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ (الانعام: ۱۳۷)

”اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوش نما بنا دیا ہے، تا کہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔“

یہ شرکاء کون تھے جنھوں نے قتل اولاد کو خوش نما بنا دیا تھا؟ کیا پتھر کے بت؟ نہیں! زندہ انسان، خیر خواہانِ قوم، رہبرانِ ملک۔ یہ رہبر (جو قوم کو تباہی کے گڑھے کی طرف لے جا رہے ہیں) آج بھی موجود ہیں اور علم و سائنس کی بڑی بڑی سندوں اور قابلیتوں سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ بے آب و گیاہ وادی کی وہ جہالت بھی جہالت ہی تھی، جہاں کی زمین زراعت کے لائق نہ تھی اور اناج کے لیے وہ لوگ بالکل دوسروں کے دست نگر تھے، لیکن گنگ و جمن کے دو آبے اور پنج آب کے احاطے میں جہاں کی زمینیں لہلہاتی ہوئی کھیتیاں ہیں، جہاں ہر طرف آنکھوں

ٹھنڈک پہنچانے والی ہریالی ہے اور جہاں زراعت کی ترقی کے کثیر مواقع ہیں، اس جہالت کو کیا کہا جائے گا؟ ترقی یافتہ حماقت یا ارتقائی جہالت!

قرآن میں اسی سلسلۂ بیان میں قتلِ اولاد کی حماقت ان الفاظ میں ظاہر کی ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ (الانعام:۱۴۰)

"بے شک ٹوٹے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بغیر سمجھے بوجھے قتل کیا اور اپنے اوپر اللہ کی دی ہوئی روزی کو حرام ٹھہرالیا، اللہ پر بہتان باندھ کر۔"

جو لوگ قتل اولاد کے مرتکب ہوتے ہیں وہ آخرت میں تو گھاٹے اور ٹوٹے میں ہوں گے ہی، دنیا میں بھی ان کے گھاٹے کی کوئی حد نہیں ہے۔ یہ نقصان صرف اسی شخص کو نہیں پہنچتا جو یہ ظالمانہ حرکت کرتا ہے، بلکہ اس کا خمیازہ پوری قوم اور پورے ملک کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اللہ اور آخرت پر جس کا ایمان ہو وہ یہ حرکت کبھی نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نسل کشی کو منافقین کی صفت قرار دیا ہے:

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ (البقرۃ:۲۰۵)

"اور وہ جب (تمہارے پاس سے) پلٹتا ہے تو اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل کو تباہ کرے اور اللہ فساد کو ناپسند کرتا ہے۔"

یعنی منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں اور اپنے ایمان واسلام کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جب تمہارے پاس سے واپس جاتے ہیں تو ملک میں کھیتوں کی تباہی اور نسل کشی کا فساد پھیلاتے ہیں۔ برتھ کنٹرول اور خاندانی منصوبہ بندی بھی فی الواقع نسل کشی کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ تحریک انہی لوگوں نے چلائی ہے۔ جن کو نہ خدا پر بھروسہ تھا اور نہ آخرت پر یقین۔ ایک صحیح حدیث میں نبی ﷺ نے شرک کے بعد قتل نفس کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔ (بخاری)

اولاد بھی آزمائش ہے

انسان اس دنیا میں آزمائش ہی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ خود اس کی اپنی جان اور جو کچھ بھی اللہ نے اسے دے رکھا ہے، سب آزمائش ہے۔ ان آزمائشوں میں دو بڑی آزمائشیں اموال و اولاد ہیں۔ اس آزمائش میں وہی لوگ پورے اترتے ہیں جو افراط وتفریط سے بچ کر اعتدال کی

راہ اختیار کرتے ہیں۔ اولاد کے معاملے میں افراط یہ ہے کہ اس کی محبت اللہ کی محبت پر غالب آجائے اور وہ اللہ کی اطاعت میں حارج بننے لگے اور تفریط یہ ہے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کے بجائے ظالمانہ روش اختیار کی جائے اور اس کے حقوق تلف کیے جانے لگیں۔ قرآن نے تاکید وحصر کے صیغے کے ساتھ اموال و اولاد کو فتنہ (آزمائش) کہا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اعتدال غائب تھا۔ یا تو تفریط اس حد تک پہنچی تھی کہ لوگ اولاد کو قتل کرنے سے بھی نہ شرماتے تھے۔ یا افراط کا یہ عالم تھا کہ بیٹوں کی کثرت پر فخر کرتے، ان کی طاقت کے بل پر غرور کرتے، بلکہ ان کو تقرب الٰہی کا بھی ذریعہ قرار دیتے۔ اللہ نے بتا دیا کہ ان کی حیثیت آزمائش کی ہے۔ ان کی کثرت تقربِ الٰہی کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ اس آزمائش میں پورا اترنا تقرب کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ اگر ایمان اور عمل صالح اس کے ساتھ موجود ہو۔ سورۂ سبا میں ہے:

وَمَا اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِیْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ آمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحاً فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَ هُمْ فِي الْغُرُفٰتِ آمِنُوْنَ۝ (سبا:۳۷)

''تمہارے اموال و اولاد وہ چیز نہیں ہیں جو تمہارا درجہ ہمارے پاس قریب کردیں۔ قریب تو وہ لوگ ہوں گے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے۔ انہی کے لیے ان کے عمل کا دو چند بدلہ ہے اور وہی لوگ بہشت کے جھروکوں میں امن وامان کے ساتھ رہیں گے۔''

مومنوں کو امانتوں میں خیانت سے روکتے ہوئے فرمایا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ۝

(الانفال:۲۸)

''اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد سامانِ آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔''

آیت کا سیاق وسباق بتا رہا ہے کہ جس طرح اموال خدا کی دی ہوئی امانت ہیں، اسی طرح اولاد بھی اس کی عطا کردہ امانت ہیں۔ وہ بھی آزمائش ہیں اور یہ بھی آزمائش ہیں۔ اموال کو اگر غلط مصارف میں خرچ کیا جائے یا صحیح مصارف میں خرچ نہ کیا جائے تو یہ خیانت ہوگی۔ یہی معاملہ اولاد کا ہے۔ ان کو اگر غلط مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے، نظام باطل کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے، جہاد فی سبیل اللہ کے بجائے انہیں طاغوتی جنگوں کی آگ میں جھونکا جائے تو

یہ اموال کی خیانت سے بڑی خیانت ہوگی۔ سورۂ تغابن میں بھی اموال واولاد کو فتنہ کہا گیا ہے اور وہاں بعض اولاد کو دشمن قرار دے کر ان سے بچتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ وہی اولاد دشمن ہوتی ہے جو خدا کی اطاعت میں مانع ہو اور اس کی محبت خدا کی محبت پر غالب آ جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے:

وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○ (التغابن: ۱۴)

''اور اگر معاف کرو اور درگزر کرو اور بخشو تو بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے۔''

ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے سورۂ تغابن کی ان آیات کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا: واقعہ یہ ہوا تھا کہ مکہ میں کچھ لوگ مسلمان ہوئے اور انہوں نے ہجرت کر کے مدینہ آنا چاہا تو ان کی بیویاں اور بچے ان کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے اور وہ ان کی محبت کی وجہ سے جلد ہجرت نہ کر سکے۔ جب وہ مدینہ آئے تو انہوں نے دیکھا کہ جو لوگ پہلے ہجرت کر کے چلے آئے تھے انہوں نے اچھی خاصی حد تک علم دین حاصل کر لیا ہے اور یہ لوگ اپنی بیویوں اور بچوں کی رکاوٹ سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ دیکھ کر انہیں غصہ آیا اور انہوں نے ان کو سزا دینی چاہی۔ تب یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ (امام ترمذیؒ نے یہ روایت اپنی جامع میں نقل کی ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے)

آیت اور اس کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ ازواج واولاد کی غلطیوں پر ہر وقت تیغ برہنہ رہنا اور سزا دیے بغیر نہ چھوڑنا مکارمِ اخلاق کے خلاف ہے۔ جس طرح اولاد پر لازم ہے کہ ماں باپ کو اف تک نہ کہے، اسی طرح ماں باپ پر بھی لازم ہے کہ اپنی اولاد سے حسن سلوک کرے اور ان کی غلطیوں سے اس حد تک درگزر کرے جس حد تک شریعت نے اجازت دی ہے۔

ازواج واولاد کا سب سے بڑا حق

ازواج واولاد کا سب سے بڑا حق خاندان کے سرپرست پر یہ ہے کہ وہ انہیں خدا کے عذاب سے بچانے کی سعی کرے اور یہ بات اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو اس عذاب سے بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اگر کسی کا عقیدۂ آخرت دھندلا ہو گیا ہو، اس پر حبِ دنیا کا میل جم گیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کی سعی وجہد کا بڑا حصہ یا تمام حصہ صرف دنیا کی خوش حالی اور ترقی پر مرکوز ہو جائے گا۔ اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے اس خوش حالی کو حاصل کرنے میں وہ اتنا منہمک ہو جائے گا کہ آخرت کی کامیابی وناکامیابی سے اسے کوئی بحث

باقی نہیں رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں اہل وعیال کی یہ ذمہ داری سرپرست پر ڈالی ہے وہاں سب سے پہلے اس کے اپنے نفس کا ذکر کیا ہے:

يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم:۶)

''اے مومنو! اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ سے بچاؤ۔''

اس میں ''اَنْفُسَكُمْ'' کا ٹکڑا پہلے اسی لیے لایا گیا ہے کہ جو شخص خود اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچانے کی سعی نہ کرے وہ دوسروں کو بچانے کی کیا سعی کرے گا۔ بہرحال اس آیت نے واضح کر دیا کہ اہل وعیال کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ انہیں خدا کا فرماں بردار بنانے کی سعی کی جائے۔ یہ سب سے بڑا حسنِ سلوک ہے جو کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ کر سکتا ہے۔ حضورؐ نے بھی فرمایا ہے کہ ''تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ خاندان کا سرپرست راعی ہوتا ہے اور گھر والے اس کی رعیت ہوتے ہیں۔ اللہ اس سے پوچھے گا کہ تم نے اپنی رعیت کو سیدھی راہ پر چلانے کی کیا کوشش کی تھی۔'' (بخاری ومسلم) اس سلسلے میں سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ والدین خود اسلام کا چلتا پھرتا نمونہ ہوں اور اپنے اعمال وحرکات سے اسلامی اخلاق کی تعلیم دیں۔ عمل اگر زبانی تعلیم کے برخلاف ہو تو اولاد پر اس کا الٹا اثر مرتب ہوگا۔ اس کے بعد کی کوشش یہ ہے کہ وہ اولاد کی اچھی تعلیم وتربیت کا بندوبست کریں اور ان کی دینی واخلاقی ضروریات کو دنیوی ضروریات سے زیادہ اہمیت دیں۔

حضرت لقمان کی نصیحت

اولاد کی بہتر تعلیم وتربیت کا سب سے اچھا نمونہ وہ نصیحت ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھی۔ میں یہاں اس نصیحت کے نکات کو ترتیب سے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۱) يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۗ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (لقمان:۱۳)

''اے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرا۔ بلاشبہ شرک بڑا ظلم ہے۔''

انسان کے جتنے اعمال ہیں، وہ کسی نہ کسی تصورِ حیات، کسی نہ کسی خیال وعقیدے کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس لیے عقیدہ کو اصل واساس کی حیثیت حاصل ہے۔ اللہ نے انسان کو سب سے پہلے جس عقیدے کا مکلّف کیا ہے وہ عقیدۂ توحید ہے۔ اس دنیا میں شرک سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہے اور توحید سے بڑا کوئی عدل نہیں ہے۔ عقیدۂ توحید دوسرے تمام اعتقادات وایمانیات کی اصل

ہے۔ ایمان کے بغیر بڑا سے بڑا نفع بخش کام خدا کی نظر میں بے وزن ہے اور ایمان کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی باوزن ہے۔ انسان کے پاس دو قوتیں ہیں: قوتِ علمی ونظری اور قوتِ عملی۔ قوتِ نظری کی تکمیل عقیدۂ توحید سے ہوتی ہے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر حضرت لقمان نے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا فرمائی تھی، اپنی پر حکمت نصیحت کی ابتدا عقیدۂ توحید سے کی۔ شرک سے براءت اور عقیدۂ توحید پر استقامت خدا کا حق ہے۔ اس کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ حضرت لقمان کی نصیحت میں والدین کے حق کا ذکر نہ تھا۔ اس کمی کو اللہ تعالیٰ نے خود پورا کر دیا ہے۔ مذکورہ آیت کے بعد دو آیتیں جملہ معترضہ کے طور پر والدین کے حق کو بیان کرتی ہیں، جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

﴿۲﴾ يَا بُنَيَّ إِنَّهَآ إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمٰوٰتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللّٰهُ إِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ ۝ (لقمان:۱۶)

''اے بیٹے اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر کسی پتھر میں یا آسمان وزمین کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی ہو تو اللہ اسے لا حاضر کرے گا۔ بہ تحقیق اللہ چھپی چیزوں کو جانتا ہے اور ہر شے سے خبردار ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے کمالِ علم وقدرت اور عقیدۂ جزا وسزا کی تعلیم ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کو ہر طرح کی کھلی اور چھپی برائیوں سے بچاتا اور سات پردوں میں بھی اسے خدا کا مطیع وفرماں بردار رکھتا ہے۔ دنیا بھر کی دیانت دار پولیس اور فوج بھی اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ جرائم کا خاتمہ اتنی کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتی جس قدر تنہا یہ عقیدہ ان کا خاتمہ کرتا ہے۔ ایک طرف تو یہ عقیدہ برائیوں سے بچانے کی سب سے کامیاب ترہیب ہے اور دوسری طرف نیک عملی اختیار کرنے کی سب سے موثر ترغیب بھی ہے۔ سات پردوں کے اندر خدا کی بندگی واطاعت کرتے ہوئے بھی مومن مطمئن ہوتا ہے کہ اس کی یہ اطاعت، اس کی یہ نیکیاں ضائع جانے والی نہیں ہیں۔ ایک نگاہِ کرم ہے جو دیکھ رہی ہے اور ممکن نہیں کہ اس کا صلہ نہ ملے۔

﴿۳﴾ يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ ''اے بیٹے! نماز قائم کرو۔''

قوتِ نظری کی تکمیل کے بعد قوتِ عملی کی تکمیل کا حکم دیا۔ جس طرح عقائد کی اصل توحید ہے، اسی طرح عبادات کی اصل نماز ہے۔ اقامت صلوٰۃ کے بغیر دین حق پر استقامت ممکن نہیں۔

اگر چہ نماز باجماعت کا تعلق اجتماعی زندگی کے ساتھ جڑ جاتا ہے، لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ایک ایسی نیکی ہے جو خود نماز پڑھنے والے کی ذات کو مکمل کرتی ہے اور اسے خدا کی کامل بندگی کے لیے تیار کرتی ہے۔ دوسروں سے اس کا تعلق ضمنی ہے۔

﴿۴﴾ وَ اْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ انْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ

''معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کر۔''

اس نصیحت نے بتایا کہ مومن صرف اپنی ذات کا ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ دوسروں کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی گئی ہے۔ خود ہدایت یافتہ ہونا اس وقت تک مکمل نہیں جب تک دوسروں کو ہدایت یافتہ بنانے کی سعی نہ کی جائے۔ اس نصیحت نے یہ بھی بتایا کہ اجتماعی صلاح وفلاح کی ذمہ داری کچھ شریعت محمدی کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ خدا کی نازل کردہ تمام شریعتوں میں مومنوں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اجتماعی صلاح وفلاح کی کوشش کریں۔

﴿۵﴾ وَ اصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان:۱۷)

''جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر۔ بے شک یہ ایسے کام ہیں جن کو انجام دینا ضروری ہے۔''

عزم کسی کام کے پختہ ارادے کو کہتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ان ضروری امور میں ہے جو پختہ ارادے اور ہمت وثبات کے بغیر انجام نہیں پاتے، کیوں کہ اس راہ میں اذیتوں اور سختیوں کا پیش آنا عین متوقع ہے۔ لہٰذا اس راہ میں سختیاں آئیں اور مصیبتیں پہنچیں تو ان پر صبر کرنا چاہیے۔

﴿۶﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ ''لوگوں سے متکبرانہ منہ نہ پھیر۔''

﴿۷﴾ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝ (لقمان:۱۸)

''اور زمین پر اکڑ کر نہ چل۔ بے شک اللہ کسی اترانے، ڈینگ مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

لوگوں سے گال پھلانا، حقارت سے گردن ٹیڑھی کرنا، منہ پھیر لینا، زمین پر تبختر اور غرور سے اترا کر چلنا، متکبروں اور مغروروں کے خصائل وعلامات ہیں۔ کبریائی اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے اور اسی کے شایان شان بھی ہے۔ تکبر وغرور اختیار کر کے انسان خدا کی کبریائی کو چیلنج کرتا ہے۔ اس لیے یہ صفت ایمان کی عین ضد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا اور جسے وہ پسند نہ

کرے اس کے مردود و مخذول ہونے میں کیا شبہ ہے۔ مومن متواضع ہوتا ہے، متکبر نہیں ہوتا۔

(۸) وَ اقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ "میانہ روی اختیار کر، معتدل رفتار سے چل۔"

(۹) وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ؕ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ؀ (لقمان:۱۹)

"اپنی آواز نیچی کر۔ بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔"

بلاضرورت چیخ کر باتیں کرنا تہذیب کے خلاف اور تکلیف دہ بھی ہے اور بسا اوقات یہ تکبر کی علامت بھی ہے۔ حلق کی پوری قوت سے آواز نکالنا اگر کمال ہوتا تو گدھے کو سب سے باکمال ماننا پڑتا حالاں کہ اس کی آواز تمام جانوروں سے زیادہ کریہہ، بے ڈھنگی اور ناگوار ہوتی ہے۔ عام طور سے متکبر لوگ ان لوگوں کے سامنے، جنہیں وہ اپنے سے چھوٹا اور حقیر سمجھتے ہیں، بہت چیخ کر باتیں کرتے ہیں۔ شاید ان کا احساس یہ ہوتا ہے کہ دیکھو جس طرح میری آواز تمہاری آوازوں سے بلند ہے، اسی طرح میں خود تم سے بلند ہوں۔

حضرت لقمان کی یہ نصیحت نہ صرف اولاد کے لیے بہتر تعلیم و تربیت کا خاکہ ہے، بلکہ تمام انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی ایک معیاری نقشہ ہے۔ اس نقشے کے مطابق جس کسی کی تعلیم و تربیت ہو اور اس کی زندگی اسی نقشے کے مطابق پروان چڑھے وہ معاشرے اور انسانیت کے لیے معیاری اور نمونے کا انسان بن جائے گا۔

ایک حدیث میں آتا ہے:

مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نُحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ (ترمذی)

"کسی باپ نے اپنی اولاد کو اچھے ادب سے افضل اور بہتر عطیہ نہیں دیا۔"

دوسری حدیث میں ہے:

عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَكْرِمُوْا اَوْلَادَكُمْ وَ اَحْسِنُوْا اَدَبَهُمْ (ابن ماجہ)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اپنی اولاد کی عزت کرو اور ان کو اچھا ادب سکھاؤ۔"

اولاد کے لیے دعا

مومن کا کلی اعتماد اپنی سعی پر نہیں، بلکہ خدا کے فضل و کرم پر ہوتا ہے۔ وہ کسی چیز کے لیے بھی

جدوجہد کررہا ہو، اس کی نگاہیں اس کے کرم پر مرکوز اور اس کا دست سوال اپنے مالک کے سامنے پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اولاد کی اچھی تربیت بہت بڑی نیکی ہے، صدقۂ جاریہ ہے، اس کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے۔ اچھی اولاد اور اولاد کی اچھی تربیت کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کی دعائیں بھی قرآن میں منقول ہیں۔ سورۂ فرقان میں عباد الرحمٰن کی جو صفات گنائی گئی ہیں ان میں ایک صفت یہ ہے:

وَ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۝ (الفرقان:۷۴)

''اور وہ لوگ جو کہتے ہیں: ہائے ہمارے رب! ہمیں ہماری ازواج اور اولاد کی طرف سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا کر اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔''

''آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کر'' سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنا مطیع وفرماں بردار بنا۔ ازواج و اولاد جب خدا کی اطاعت میں مومن کے معاون و مددگار رہتے ہیں تو اس کا دل ان سے خوش ہوتا ہے اور انہیں دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں اور اگر خدانخواستہ معاملہ برعکس ہو تو پھر وہ سوہانِ روح بن جاتے ہیں۔

یہ گویا خود خدا کی طرف سے تعلیم ہے کہ تم اپنی بیوی بچوں کے صالح بننے کی دعائیں کرتے رہو۔ ماں باپ کی دعائیں اولاد کے حق میں قبول کی جاتی ہیں، اس لیے اولاد کی غلط حرکتوں سے آزردہ ہو کر ان کے لیے بددعا نہ کرنی چاہیے، بلکہ ان کی اصلاح اور ہدایت کے لیے خدا کے سامنے دست سوال دراز کرنا چاہیے۔

لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کی مزید تاکید

جس طرح ماں کے لیے حدیثوں میں حسن سلوک کی مزید تاکید آئی ہے، اس طرح لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کی مزید ترغیب وتاکید بھی موجود ہے۔ اس کا ایک سبب تو جاہلیت عرب کا وہ خیال ہے جو لڑکیوں کے بارے میں پایا جاتا تھا۔ اس خیال کی اصلاح کے لیے لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کی مزید تاکید کی گئی۔ دوسرا سبب عورتوں کا فطری ضعف اور ان کی ذہنی وجسمانی کمزوریاں ہیں، جس کی وجہ سے وہ مدد اور احسان کی زیادہ محتاج ہیں:

اِنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ حَدَّثَتْهُ قَالَتْ جَاءَتْنِي اِمْرَاَةٌ وَ مَعَهَا ابْنَتَانِ

تَسْاَلُنِیْ فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِیْ غَیْرَ تَمْرَةٍ وَاحِدَةٍ فَاَعْطَیْتُهَا فَقَسَّمَتْهَا بَیْنَ ابْنَتَیْهَا ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ فَدَخَلَ النَّبِیُّ ﷺ فَحَدَّثْتُهُ فَقَالَ مَنِ ابْتُلِیَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ شَیْئًا فَاَحْسَنَ اِلَیْهِنَّ کُنَّ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ (متفق علیہ)

''نبی ﷺ کی زوجہ مکرمہ حضرت عائشہؓ نے بیان فرمایا کہ میرے پاس ایک عورت اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ سوال کرتی ہوئی آئی۔ میرے پاس ایک کھجور کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نے وہی دے دیا۔ اس نے اس کو اپنی دونوں بیٹیوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور پھر روانہ ہوگئی۔ اس کے بعد حضورؐ آئے تو میں نے واقعہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: جو شخص بھی ان بیٹیوں سے آزمایا جائے اور وہ ان کے ساتھ احسان کرے تو وہ اس کے لیے دوزخ سے حجاب بن جائیں گی۔''

آپ کی اس تعلیم نے اسلامی معاشرے میں لڑکیوں کے درجے کو بلند کر دیا اور ان کی تحقیر و توہین کے وہ جذبات ختم ہوگئے جو جاہلیت میں پائے جاتے تھے۔

مغربی جاہلیت

اصل جاہلیت زندگی کا مادّی نقطۂ نظر ہے۔ جس تہذیب پر یہ نقطۂ نظر غالب آ جاتا ہے وہ جاہلی تہذیب بن جاتی ہے اور پھر انسانیت وحیوانیت میں روح اور جوہر کے لحاظ سے کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ آج یورپ اور امریکہ پر یہی مادی، جاہلی تہذیب چھائی ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کا معاشرہ اخلاقی وروحانی اعتبار سے ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہے۔ والدین اور اولاد میں بس اتنا ہی تعلق باقی ہے جتنا جانوروں اور ان کے بچوں میں ہوتا ہے۔ اولاد کے بالغ ہوتے ہی ان کی ساری ذمہ داری سے والدین اپنے آپ کو فارغ کر لیتے ہیں اور اپنے گھر سے انہیں الگ کر دیتے ہیں اور اگر گھر کے کسی ضرورت سے زائد حصے کو وہ استعمال کریں تو انہیں باضابطہ کرایہ دینا پڑتا ہے اور وہ کرایہ دار کی حیثیت سے وہاں رہتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ان کی شادی بیاہ سے بھی والدین کو کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اولاد کا جہاں جی چاہے شادی کرے یا نہ کرے، والدین کو اس سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ بیٹوں کے ساتھ بھی یہ معاملہ ان پر ظلم ہے، لیکن بیٹیوں کے ساتھ یہ رویہ تو فی الواقع انسانی اخلاق کی موت کے مترادف ہے۔ یہاں دو اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ وہاں عائلی نظام کس قدر تباہ اور پراگندہ ہو چکا ہے۔

''لندن میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی، جن کے والد یہاں ۵۰ سال سے مقیم ہیں۔ انہوں نے شادی بھی یہاں کی عورت سے کی ہے اور بچے سب انگریزیت میں ہیں۔ بچے گو جوان ہیں،

مگر بے چارے اپنے آپ کو صرف نام کا مسلمان سمجھتے ہیں۔ان کے والد سے میں نے یہاں کی شادی کے رواج کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ہر لڑکا اپنی بیوی خود تلاش کر کے اپنی مرضی سے شادی کر لیتا ہے اور اس میں والدین کو کوئی دخل نہیں۔ نہ وہ لوگ شادی کرانے کی یا اس کے انتظام کی کبھی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے اس پر پوچھا: لڑکا آخر کہاں جا کر لڑکی کو تلاش کرے، کوئی خاندانی یا رشتہ داری جیسی چیز بھی تو آپ کے یہاں نہیں۔ بولے: اسکولوں، کالجوں یا باہر بازاروں وغیرہ میں۔آخر لڑکی کا بھی تو یہی حال ہے۔وہ بھی کسی لڑکے کی تلاش میں پھرتی رہتی ہے۔ گویا لڑکا پہلے کسی نامحرم سے دوستی اور اختلاط بڑھائے، اس کے بعد اگر دونوں راضی ہوں تو شادی طے پا سکتی ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ ماں باپ اور بچوں کے مابین یہاں سچی محبت ہوتی نہیں۔لڑکا جوان ہوتے ہی اس سے والدین پورا خرچ وصول کرتے ہیں۔اگر وہ والدین کے ساتھ گھر میں رہتا ہے تو اسے گھر کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے۔گویا بچوں جوان ہوتے ہی ان سے اجنبیوں کا سا برتاؤ ہو جاتا ہے، جیسے جانوروں میں ہوا کرتا ہے۔'' (مکتوب فرنگ، صدق، ۱۹/اگست ۱۹۶۰ء)

جاہلیت عرب میں بھی صحیح روحانیت اور اخلاقی زندگی مغلوب تھی، لیکن اس جدید جاہلیت نے تو انسانیت کا خاتمہ ہی کر دیا ہے۔اس کے نزدیک انسان 'ترقی یافتہ جانور' کے سوا کچھ نہیں۔ اوپر کا اقتباس کسی تشریح کا محتاج نہیں۔آگے کے اقتباس میں دیکھئے کہ یہ حیوانیت سنگ دلی میں کتنی ترقی کر چکی ہے۔

استاذ علی طنطاوی (شام) لکھتے ہیں:

''ان کے یہاں لڑکی جب بالغ ہو جاتی ہے تو اس کا باپ اس کے اخراجات سے اپنا ہاتھ سمیٹ لیتا ہے اور اپنے گھر کا دروازہ اس کے لیے بند کر دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اب جاؤ، کھاؤ کماؤ، ہمارے یہاں اب تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ وہ غریب مجبوراً اپنے گھر سے نکل جاتی ہے اور زندگی کی ساری سختیاں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ در بدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے، لیکن والدین کو اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ وہ زندگی کس طرح بسر کر رہی ہے۔محنت کر کے کھاتی کماتی ہے یا جسم بیچ کر اپنا پیٹ بھرتی ہے اور یہ بات صرف امریکہ میں نہیں ہے، بلکہ سارے مغربی ممالک کا یہی حال ہے۔ میرے استاد یحیٰی شماع نے آج سے ۲۳ سال قبل جب وہ پیرس میں اپنی تعلیم ختم کر کے آئے تھے، مجھ سے بیان کیا کہ وہ اس وقت وہاں اپنے ٹھہرنے کے لیے ایک کمرہ کی تلاش میں ایک مکان پہنچے، جہاں ایک کمرہ خالی تھا تو مکان کے دروازے سے ایک لڑکی نکلتی ہوئی انہیں ملی۔اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ڈاکٹر یحیٰی نے مکان کے مالک سے اس کے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ ہماری لڑکی ہے۔اب یہ ہم سے الگ رہتی ہے۔

انہوں نے پوچھا: یہ کیوں رو رہی ہے؟ اس نے کہا: یہ ہمارے یہاں ایک کمرہ کرایہ پر لینے آئی تھی اور ہم نے اس کو دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے پوچھا: کیوں؟ اس نے کہا کہ یہ اس کمرہ کا کرایہ بیس فرانک (دس آنے کے برابر ایک سکہ) دے رہی ہے اور دوسروں سے ہم کو اس کا کرایہ تیس فرانک مل رہا ہے۔'' (ماہنامہ رضوان)

یہ وہ مادہ پرستانہ سنگ دلی ہے کہ گئی گزری حالت میں بھی مشرق کے لوگ اس کا تصور نہیں کر سکتے، بلکہ اس طرح کے واقعات سننے کے بعد انہیں شک گزرتا ہے کہ آیا یہ واقعات صحیح بھی ہیں؟ لیکن شک کی کوئی وجہ نہیں۔ انسان کے اعمال اس عقیدے اور اس نقطۂ نظر کے نتائج ہوتے ہیں جو وہ زندگی کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ مغرب کے لوگوں نے اپنے آپ کو حیوان مطلق سمجھ لیا ہے۔ اس لیے اس طرح کی سنگ دلی ان سے بعید نہیں ہے۔

مغربی عورت اس صورتِ حال سے جس قدر پریشان، عاجز اور دل تنگ ہے، اس کا نقشہ بھی علی طنطاوی کے مضمون میں موجود ہے:

''مجھ سے شیخ بہجۃ البیطار (شام کے ایک مشہور محقق عالم جو دمشق میں مقیم ہیں) نے بیان کیا کہ انہوں نے امریکہ میں 'مسلمان عورت' کے موضوع پر ایک لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ ہماری شریعت میں اس کو مالی معاملات میں حق خود مختاری حاصل ہے۔ چناں چہ اس کے مال میں اس کے شوہر حتیٰ کہ اس کے باپ کو بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اگر عورت تنگ دست و پریشان حال ہو تو اس کے تمام اخراجات کا کفیل اس کے باپ یا بھائی کو ہونا پڑے گا اور اگر اتفاق سے اس کا باپ یا بھائی موجود نہ ہو تو اس کے عزیزوں میں سے کوئی بھی اس کے کھانے کپڑے کا خرچ برداشت کرے گا، خواہ اس کا وہ عزیز اس کا چچازاد بھائی ہو یا کوئی اور، جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے یا کہیں کوئی مال و دولت اس کے ہاتھ نہ آ جائے، وہ برابر اس کی کفالت کرتا رہے گا۔ شادی کے بعد اس کا شوہر اس کے تمام اخراجات کا ذمہ دار ہوگا، چاہے وہ شوہر ایک غریب مزدور ہی کیوں نہ ہو اور بیوی کروڑ پتی۔ لیکچر ختم ہونے کے بعد ایک امریکن خاتون، جو وہاں کی ایک مشہور ادیبہ تھی، کھڑی ہوئی اور اس نے کہا کہ اگر عورت کو آپ کے مذہب میں یہی حقوق حاصل ہیں جو آپ بیان کر رہے ہیں تو پھر مجھے اپنے یہاں لے چلیے۔ میں وہاں رہ کر صرف چھ مہینے زندگی بسر کروں گی۔ اس کے بعد مجھے قتل کر دیجیے، تب بھی مجھے کوئی حسرت نہ ہوگی۔''

('یورپ کی مظلوم عورت' ماہنامہ رضوان)

یہ ہے مغربی معاشرے کا حال، جس کی بنیادیں انسان کو مجرد حیوان سمجھ کر اٹھائی گئی ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر

لڑکیوں کے حقوق کا مختصر بیان شیخ بہجۃ البیطار کی تقریر میں گزر چکا۔ ان حقوق کو ادا کرنے کا اجر و صلہ کیا ہے، اس کے لیے ایک حدیث اوپر گزر چکی۔ اس سلسلے کی چند حدیثیں یہاں اور پیش کی جاتی ہیں:

(ابو سعید) رَفَعَهُ: مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ اَوْ ثَلَاثَ اَخَوَاتٍ اَوْ اُخْتَيْنِ اَوْ بِنْتَيْنِ فَاَدَّبَهُنَّ وَ اَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ وَ زَوَّجَهُنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ (ترمذی و ابوداؤد)

''حضرت ابوسعید خدریؓ نے مرفوع حدیث بیان کی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے تین بیٹیوں یا تین بہنوں یا دو بہنوں یا دو لڑکیوں کی کفالت کی، ان کو ادب سکھایا، ان کے ساتھ احسان کیا اور ان کی شادی کر دی تو اس کے لیے جنت ہے۔''

دوسری حدیث میں ہے:

(انس) رَفَعَهُ مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَنَا وَ هُوَ كَهَاتَيْنِ ضَمَّ اَصَابِعَهُ. (مسلم)

''حضورؐ نے فرمایا: جس نے دو لڑکیوں کی کفالت کی، یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں تو قیامت میں، میں اور وہ شخص ساتھ ساتھ ہوں گے (یہ فرماتے ہوئے آپؐ نے اپنی انگلیوں کو ملایا)۔''

کسی مومن کے لیے اس سے بڑی کوئی بشارت نہیں ہو سکتی کہ قیامت میں اسے نبی ﷺ کی رفاقت نصیب ہو۔

لڑکوں کو ترجیح نہ دی جائے

اسلام نے جاہلیت کی کسی بری چیز کو جب ختم کیا ہے تو اس طرح ختم کیا ہے کہ اس کے دوبارہ رائج ہونے کا دروازہ بند ہو جائے۔ بیٹیوں کے ساتھ ظلم کی وجہ یہ تھی کہ عرب کے لوگ بیٹوں کو ان پر ترجیح دیتے تھے اور ان کے مقابلے میں بیٹیوں کو ذلیل سمجھتے تھے۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کہ والدین اپنی زندگی میں لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح نہ دیں، بلکہ لین دین اور حسن سلوک میں دونوں کو برابر رکھیں۔ یہ اس لیے کہ وہ جاہلانہ ذہنیت پھر نہ پیدا ہو۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

مَنْ كَانَتْ لَهُ اُنْثٰى فَلَمْ يَئِدْهَا وَ لَمْ يُهِنْهَا وَ لَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهُ يَعْنِى الذُّكُوْرَ

عَلَيْهَا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ (ابوداؤد)

''جس کے یہاں لڑکی ہوئی تو اس نے اسے زندہ دفن نہیں کیا، اس کی تحقیر و تذلیل نہ کی اور اپنے بیٹوں کو اس پر ترجیح نہ دی تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔''

لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک ان کی شادی کر دینے کے بعد ختم نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کو طلاق دے دی جاتی ہے یا اس کا شوہر مر جاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ پھر مجبور و محتاج ہو جاتی ہے۔ والدین پر لازم ہے کہ اس حال میں وہ اپنے یہاں اس کو پناہ دیں:

(سراقة بن مالک) رَفَعَه: اَلاَ اَدُلُّکَ عَلٰی اَفْضَلِ الصَّدَقَةِ؟ اِبْنَتُکَ مَرْدُوْدَةٌ اِلَيْکَ لَيْسَ لَهَا کَاسِبٌ غَيْرُکَ (ابن ماجہ، کتاب الادب)

''سراقہ بن مالک کہتے ہیں: مجھ سے حضورؐ نے فرمایا: کیا میں تجھے بہترین صدقہ کی خبر نہ دوں؟ تیری بیٹی تیری طرف لوٹا دی جائے اور تیرے سوا کوئی اس کے لیے کمانے والا نہ ہو۔''

یعنی طلاق کی وجہ سے یا شوہر کی موت کے سبب سے تیری بیٹی پھر تیرے گھر آ جائے اور اس کا کوئی ذریعۂ آمدنی نہ ہو تو اس بیٹی پر خرچ کرنا اور اس کی کفالت کرنا بہترین صدقہ ہے۔ یہ ہے وہ روحانی اور اخلاقی نقطۂ نظر جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے۔ لیکن یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ مغربی عورتیں اپنے یہاں کی معاشرت سے پریشان ہیں اور اسلامی معاشرے کو نجات کا سبب سمجھ رہی ہیں اور یہاں بہتیری مسلمان عورتیں مغربی معاشرے پر جان چھڑک رہی ہیں۔ اس کی کئی وجہیں ہیں: ایک تو یہ کہ وہ خود اسلامی معاشرے کی بنیادوں اور اس کی بہترین تعلیمات سے ناواقف ہیں، دوسری یہ کہ مغرب کی ظاہری چمک دمک ان کی بصیرت کو اندھا بنا رہی ہے۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی ہیں کہ اسلام کی آغوش رحمت کے سوا ان کے لیے کہیں پناہ نہیں ہے، تیسری یہ کہ مسلمان خاندانوں کے سرپرست بھی لڑکیوں کے حقوق سے ناواقف ہو گئے ہیں، یا جان بوجھ کر جاہلی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان کے حقوق میں یہ بھی ایک بڑا حق ہے کہ شادی کے وقت ان کی مرضی ضرور معلوم کی جائے۔ ان کی مرضی کے بغیر ان کی شادی نہ کی جائے۔ بہت موقعوں پر والدین اس کی پروا نہیں کرتے، جس کا انجام کبھی کبھی بہت برا ہوتا ہے۔

جوابِ سلام میں احسان

سلام شریعت اسلامیہ میں آپس کے اتحاد و اتفاق، محبت و الفت اور یگانگت کی ایک بڑی

علامت ہے۔ یہ ایک تدبیر ہے جو باہمی کدورتوں، رنجشوں اور اختلافات کو مٹانے کے لیے سکھائی گئی ہے، کیوں کہ سلام کی حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن اپنے قلب کی اس کیفیت کا اظہار کرتا ہے جو دوسرے مومن کے لیے اس میں موجود ہوتی ہے۔ یہ ایک دعا ہے جو وہ اپنے بھائی کو دیتا ہے۔ خدا کی بارگاہ میں ایک اچھی سفارش ہے جو وہ اپنے بھائی کے لیے کرتا ہے، وہ السلام علیک کہہ کر یہ ظاہر کرتا ہے کہ میرے پاس تمہارے لیے امن اور سلامتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر خدا سے درخواست کرتا ہے: اے خدا! اس بندے کو اپنے حفظ وامان میں رکھ اور اس پر اپنی سلامتی نازل فرما۔ جس دل سے یہ دعا نکلے اس میں مخاطب کے لیے رنجش، کدورت، بغض اور عناد کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔ اور اگر یہ الفاظ محض رسماً ادا کر دیے گئے ہیں، دل سے ان کا کوئی تعلق نہیں تو پھر یہ سلام کا بے روح ڈھانچہ ہوگا، فی الواقع سلام نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ سلام کا جواب دینے والے کے لیے اللہ نے احسان کی ترغیب دی ہے۔ یعنی وہ دعا دینے والے کو اس کی دعا سے بہتر دعا دے۔ وہ اس سے بڑھ چڑھ کر اپنے خلوص اور اس کے لیے اپنے جذبۂ محبت کا اظہار کرے۔ وہ خدا کی بارگاہ میں سلام کرنے والے سے بہتر سفارش لے جائے اور اس کو یقین دلائے کہ میرے پاس بھی تمہارے لیے اس سے زیادہ امن وسلامتی ہے جس قدر میرے لیے تمہارے پاس ہے۔ غور کیجیے، خلوص کے ساتھ اگر سلام وجوابِ سلام موجود ہے تو پھر ایسے دو شخصوں کے درمیان بغض وعناد کا کیا سوال باقی رہتا ہے۔ قرآن میں ہے:

وَ اِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝ (النساء:۸۶)

”اور جب کوئی تمہیں سلام کرے تو اس سے بہتر اس کا جواب دو یا (کم سے کم) وہی لوٹا دو، بے شک اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔“

علماء نے لکھا ہے کہ ابتداءً کسی مسلمان کو سلام کرنا بڑی نیکی ہے، لیکن واجب نہیں ہے اور سلام کا جواب سلام سے دینا واجب ہے اور بہتر طریقے سے جواب دینا احسان ہے، جس کی ترغیب اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ بہتر طریقے کے ساتھ جواب کی تعلیم وتشریح احادیث میں ملتی ہے:

عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍؓ اَنَّ رَجُلاً جَاءَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ عَشْرٌ وَجَاءَ آخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَةُ

اللّٰہِ فَقَالَ عِشْرُوْنَ ثُمَّ جَاءَ اٰخَرُ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہٗ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ ثَلٰثُوْنَ (ترمذی)

''عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور کہا، السلام علیکم تو حضورؐ نے فرمایا: اس کے لیے دس نیکیاں ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد دوسرا شخص آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ، تو آپؐ نے فرمایا: اس کے لیے بیس نیکیاں ثابت ہوئیں۔ پھر تیسرا شخص آیا۔ اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپؐ نے فرمایا: اس کے لیے تیس حسنات ثابت ہوئے۔''

یہ حدیث اگرچہ ابتداءً سلام کے سلسلے کی ہے لیکن اسی سے بہ طریق احسن جواب کی تعلیم بھی نکلتی ہے۔ یعنی اگر کوئی صرف سلام کرے تو جواب میں ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کا اضافہ کیا جائے اور اگر کوئی ابتداءً ہی رحمت و برکت کو بھی اپنے سلام میں داخل کر لے تو اسی طرح جواب دینا بہ طریق احسن جواب میں داخل ہے۔ حضرت ابن عباس وابن عمر رضی اللہ عنہم ''وَ بَرَکَاتُہٗ'' پر اضافہ ناپسند کرتے تھے۔ ابن عباسؓ فرماتے تھے کہ سلام برکت تک پہنچ کر منتہی ہو جاتا ہے، یعنی اب اس پر کوئی اور لفظ نہیں بڑھانا چاہیے۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کو ''وَ بَرَکَاتُہٗ'' تک سلام کیا۔ آپ نے جواب میں اسی کو لوٹا دیا تو اس شخص نے کہا: یا رسول اللہ! قرآن میں تو بہ طریقِ احسن جواب کا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا: تم نے کوئی فضیلت چھوڑی کب کہ میں اضافہ کرتا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وَ بَرَکَاتُہٗ پر اضافہ نہ کیا جائے۔ ویسے بعض احادیث میں ''وَ مَغْفِرَتُہٗ وَ رِضْوَانُہٗ'' کے الفاظ بھی ''وَ بَرَکَاتُہٗ'' کے بعد آئے ہیں۔

ابتداءً سلام کرنے کو اگرچہ واجب اور فرض نہیں کیا گیا ہے، لیکن اس کی فضیلت میں جو حدیثیں آتی ہیں اور اس احسان کی جس طرح ترغیب دی گئی ہے وہ اپنی جگہ اس قدر اہم ہے کہ اسے وجوب کے قریب تک پہنچا دیتی ہے۔ یہاں چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْہُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ۔ (مسلم، ترمذی)

''ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تم جنت میں داخل نہ ہو گے، یہاں تک کہ ایمان لاؤ اور تم مومن نہ ہو گے یہاں تک کہ ایک دوسرے سے محبت کرو۔ کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ بتاؤں کہ جب تم اسے کرو گے تو

آپس میں محبت ہو گی۔وہ شے یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو بکثرت سلام کیا کرو۔''

اس حدیث سے بہ صراحت معلوم ہوا کہ باہمی محبت کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی اور باہمی محبت کا ذریعہ سلام ہے، لہٰذا خود سلام تکمیلِ ایمان کا ذریعہ بن گیا۔ معمولی غور وفکر سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ کسی گروہ کی شیرازہ بندی کے لیے باہمی محبت والفت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کسی ضخیم کتاب کی جز بندی کے لیے مضبوط ڈورے کی ہوتی ہے۔ اگر مضبوط ڈورا موجود نہ ہو تو اس کی جز بندی نہیں ہو سکتی اور اگر جز بندی کے بعد وہ ڈورا بوسیدہ ہو جائے یا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے تو پھر اس کتاب کے اوراق منتشر ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کی شیرازہ بندی اور اس کی اجتماعی روح کو سلامت رکھنے کے لیے تمام ایسی تدبیریں بتائی گئی ہیں، جن سے باہمی الفت ومحبت باقی رہتی ہے، بلکہ ترقی کرتی جاتی ہے۔ یہ اللہ واسطے کی محبت اگر نہ ہو تو امت مسلمہ اپنے مقصدِ وجود کو بھول جائے گی۔ پھر نہ اجتماعیت باقی رہے گی اور نہ اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد کامیاب ہو سکے گی۔ ایک دوسری حدیث میں ہے:

اَوْلَى النَّاسِ بِاللّٰهِ مَنْ بَدَءَ هُمْ بِالسَّلَامِ (ابوداود، ترمذی)

''اللہ سے قریب تر وہ شخص ہے جو لوگوں کو سلام کرنے میں پہل کرتا ہے۔''

اَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَیُّ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ وَ تُقْرِءُ السَّلَامَ عَلٰى مَنْ عَرَفْتَ وَ مَنْ لَّمْ تَعْرِفْ. (بخاری، کتاب الایمان)

''ایک شخص نے حضورؐ سے پوچھا: اسلام کی کون سی خصلت بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہارا لوگوں کو کھانا کھلانا اور سلام کرنا، اس کو جسے تم جانتے ہو اور اس کو بھی جسے نہیں پہچانتے۔''

سلام عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں

سلام کی حقیقت اور نبی ﷺ کا جو حکم اوپر گزرا اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا ہی تھا کہ مسلمانوں کے درمیان سلام کی بکثرت اشاعت ہو۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں اس کثرت سے مسلمان ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے کہ آج وہ چیز ہمیں عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب مسلمان عام طور سے اس کی حقیقت سے ناواقف ہو گئے ہیں اور محض رسماً کبھی کبھی ایک دوسرے کو سلام کیا کرتے ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ کا عمل یہ تھا کہ آپ کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو تین بار سلام کرتے۔ ایک سلام استیذان یعنی گھر میں داخل ہونے کی

اجازت طلب کرنے کے لیے، دوسرا ملاقات کا سلام اور تیسرا رُخصتی سلام۔

صحابہ کو بھی آپ کی تعلیم یہ تھی کہ مسلمانوں کی کسی مجلس میں جائیں تو دو بار سلام کریں۔ ایک وہاں پہنچنے کے بعد اور دوسرا وہاں سے رخصت ہوتے وقت۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ دوسرا سلام بھی اسی درجے کا ہے جس درجے کا پہلا سلام ہے۔ پہلے سلام کو دوسرے پر فوقیت نہیں ہے۔ استیذان (کسی گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرنا) کے لیے سلام کی تعلیم قرآن میں موجود ہے اور نبی ﷺ نے قولاً وعملاً اس کو کر کے دکھایا ہے۔ ایک صحابی کہتے ہیں کہ سفر میں ایک دفعہ میں حضورؐ کے خیمے میں بلا اِجازت داخل ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ تم باہر واپس جاؤ اور کہو "السلام علیکم، کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟" (ترمذی)

سلام کی کثرت کا یہ حال تھا کہ جب اتفاقی طور پر راستے میں یا سفر میں درختوں کی آڑ آجاتی تھی تو اس آڑ سے نکلتے ہی صحابہؓ ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے۔ سلام کرنے میں چوں کہ اللہ تعالیٰ اجر عطا کرتا ہے اس لیے ان میں کے بعض بازار صرف اس لیے جاتے تھے کہ لوگوں کو سلام کر کے اجر حاصل کریں۔

سلام کی اہمیت اور اس کے شعار اسلامی ہونے کی جہت سے بہت سارے مسائل اس سے متعلق ہیں، جن کی تفصیل قرآن حدیث اور فقہ میں ملتی ہے۔ یہاں وہ ساری تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا گیا اس کی غرض یہ تھی کہ سلام و جواب سلام کے احسان کو اسلامی جماعت کے اتحاد میں بڑا دخل ہے اور مسلمان اس کے محتاج ہیں کہ وہ اس شعار کی حقیقت کا شعور حاصل کریں۔

محسنین کی صفات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مبحثِ احسان کو ختم کرتے ہوئے محسنین کی چند صفات کا ذکر کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ذہن میں رکھنے کی ہے کہ قرآن میں مومنین صالحین اور متقین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ سب بدرجۂ اولیٰ محسنین کی صفات بھی ہیں، کیوں کہ احسان ایمان اور تقویٰ پر ایک مستزاد صفت ہے، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۹۳ سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن، متقی اور محسن کے الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ہی صفات ہیں جو کہیں متقین کے لیے لائی گئی ہیں اور انہی کو کہیں محسنین کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

اس کی مثال ہمیں سورۂ بقرہ اور سورۂ لقمان کی ابتدائی آیتوں میں ملتی ہے۔

سورۂ بقرہ میں یہ کہہ کر کہ کتاب اللہ متقین کے لیے ہدایت ہے، ان کی حسب ذیل صفات بیان کی گئی ہیں:

۱- وہ ایسی چیزوں کا یقین رکھتے ہیں جن کو انہوں نے دیکھا نہیں، یعنی وہ مومن بالغیب ہیں۔

۲- وہ نماز قائم کرتے ہیں۔

۳- اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں۔

۴- نبی ﷺ پر جو کچھ نازل ہوا اور آپ سے پہلے کے انبیاء پر جو کچھ نازل ہوا، سب پر ان کا ایمان ہے۔

۵- وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

سورۂ لقمان میں یہ کہہ کر کہ کتابِ الٰہی محسنین کے لیے رحمت اور ہدایت ہے، ان کی تین صفات کا ذکر کیا گیا ہے: وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ متقین و محسنین کی یہ وہ بنیادی صفات ہیں، جن کے بغیر تقویٰ اور احسان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے مقامات پر جو دوسرے اوصاف بتائے گئے ہیں ان کے لیے یہی بنیادی صفات کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر آگے کی صفات میں نقص ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ان بنیادی صفات میں نقص رہ گیا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

ان بنیادی صفات کے بعد اہل احسان کی جو سب سے نمایاں صفت قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ جہاد فی سبیل اللہ ہے، جان سے بھی اور مال سے بھی۔ جہاد فی سبیل اللہ میں مال خرچ نہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے ہلاکت قرار دیا ہے:

وَ اَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ وَ اَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝ (البقرۃ:۱۹۵)

''اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ احسان کی روش اختیار کرو، بلاشبہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔''

یہاں اوپر سے جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر چلا آ رہا ہے اور اس آیت پر اس کا سلسلہ ختم کر کے

آگے حج وعمرہ کے کچھ مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ آیات کی ترتیب خود بتا رہی ہے کہ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے مراد جہاد فی سبیل اللہ میں خرچ کرنا ہے۔ اس معاملے میں خرچ نہ کرنے کو ہلاکت قرار دینے کی وجہ ظاہر ہے۔ اگر مسلمان مال کی محبت میں گرفتار ہو جائیں اور اللہ کے دین کو سربلند رکھنے میں اسے صرف نہ کریں۔ ان کے ذاتی مفادات ان کی نگاہ میں زیادہ اہم قرار پا جائیں تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ کمزور ہوں گے اور خدا کے دشمن ان کے مقابلے میں قوی ہو جائیں گے۔ مسلمان بحیثیت مجموعی مغلوب اور شکست خوردہ ہو کر رہ جائیں گے۔ اس آیت کی تفسیر حضرت ابوایوب انصاریؓ نے کی ہے، جسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے۔ حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری ومسلم کی شرط پر ہے۔ حدیث کا ترجمہ یہ ہے:

> ''اسلم بن یزید کہتے ہیں: ہم شہر روم میں تھے کہ رومیوں نے ہمارے مقابلے میں ایک بڑی فوج قلعے سے باہر نکالی۔ مسلمانوں نے بھی ان کے مقابلے میں فوج آگے بڑھائی۔ اہل مصر کے سالار عقبہ بن عامر تھے اور پوری فوج کے امیر فضالہ بن عبید تھے۔ مسلمانوں کی فوج کے ایک سپاہی نے رومیوں کی صف پر تنہا حملہ کیا اور اس میں گھس پڑا۔ لوگ چیخنے لگے اور کہنے لگے: ''سبحان اللہ! یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہا ہے'' (ان کا اشارہ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کی طرف تھا)۔ یہ سن کر ابوایوب انصاریؓ کھڑے ہوئے اور کہا: اے لوگو! تم اس آیت کی یہ تاویل کرتے ہو، حالاں کہ یہ آیت ہم گروہ انصار کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسلام کو قوی کر دیا اور اس کے مددگاروں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو ہم میں سے بعض نے بعض سے یہ بات کہی کہ ہمارے اموال دیکھ بھال کی کمی کے سبب ضائع ہو رہے ہیں۔ اسلام کی قوت اور مددگاروں کی کثرت کی بنا پر اب ہماری کچھ ایسی ضرورت نہیں ہے تو اب ہم اگر اپنے اموال کی دیکھ بھال اور ضائع شدہ مال کی اصلاح میں مشغول ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر یہ آیت اتاری اور ہماری تردید کی۔ اس نے کہا وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ اس میں تَهْلُكَة کا مطلب جہاد کو ترک کر کے اموال کی دیکھ بھال اور اس کی اصلاح میں مشغول ہو جانا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ ابوایوب انصاریؓ برابر اپنے گھر سے باہر جہاد میں مشغول رہے یہاں تک کہ مر کر روم میں دفن ہوئے۔ (ترمذی)

اسی مفہوم کی حدیث امام بخاریؒ نے حضرت حذیفہؓ سے روایت کی ہے۔ لیکن ان کی روایت میں صرف اتنا ہے کہ یہ آیت نفقہ میں نازل ہوئی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ فی النفقہ کا مطلب راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ حضرت حذیفہؓ نے جو کچھ کہا ہے وہ

تفسیر وتشریح کے ساتھ حضرت ابوایوبؓ کی حدیث میں مذکور ہے۔ ابن جریرؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور تابعین کی ایک جماعت سے بھی اس آیت کی یہی تاویل منقول ہے۔

اس آیت اور اس کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے خرچ کرنا متقیوں اور محسنوں کی صفت ہے اور خرچ نہ کرنا تقویٰ اور احسان کے خلاف ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے مقابلے میں مال و جائداد کی دیکھ بھال میں اس طرح مشغول ہو جانا کہ ترک جہاد کی نوبت آ جائے، خدا کو محبوب نہیں ہے۔ یہ بھی قابل غور ہے کہ اس وقت جب اسلام کے مددگاروں کی کمی نہ ہو، اس کی حمایت ونصرت کو ترک کرنا قبیح فعل ہے تو اس وقت ترکِ جہاد کی قباحت کا کیا حال ہوگا، جب اسلام کے حامیوں کی تعداد کم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ توبہ اور دوسری سورتوں میں ترکِ جہاد اور راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے کو منافقین کی صفت قرار دیا گیا ہے۔

مجاہدہ چراغِ راہ ہے

خلوص دل کے ساتھ شریعت کے ماتحت اللہ کی راہ میں مجاہدہ، اس کے قرب و رضا کے حصول کی جدوجہد، اس کے انعامات کی طلب میں سرگرمی محسنوں کی خاص صفت ہے اور اللہ اس دنیا میں ان کے مجاہدے کو ان کے لیے چراغ راہ بنا دیتا ہے:

وَ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (العنکبوت:۶۹)

”اور جو لوگ ہمارے لیے مجاہدہ کرتے ہیں ہم یقیناً ان کو اپنے قرب کی راہیں سجھا دیں گے اور بلاشبہ اللہ محسنوں کے ساتھ ہے۔“

لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ کا مطلب یہ ہے کہ مجاہدے کے صلے میں اللہ انہیں بصیرت کا وہ نور عطا کرتا ہے جو ان کے سامنے قربِ الٰہی کی راہیں کھولتا چلا جاتا ہے اور ہر مرحلے میں ان پر یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت انہیں کیا کرنا چاہیے اور اس وقت کون سا کام سب سے زیادہ اہم ہے۔ محسنوں کے ساتھ اللہ کی معیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی نصرت وحمایت ان کے ساتھ ہوتی ہے، وہی مشکلات ومصائب میں ان کو ثابت قدم رکھتا اور وہی سخت ماحول میں ان کو ڈھارس دیتا ہے۔

صبر، جہاد اور دُعا

سورۂ آل عمران میں اگلی امتوں کے محسنوں کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ○ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ○ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ط وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ○ (آل عمران:۱۴۶-۱۴۸)

''اس سے پہلے کتنے ہی نبی گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا۔ اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ آخرکار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی محسنین پسند ہیں۔

پھر سورۂ اعراف میں اللہ کا یہ حکم ہمیں ملتا ہے:

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ط اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ○ وَ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَ ادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ○ (الاعراف:۵۵،۵۶)

''اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔ یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو۔ خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت محسنوں سے قریب ہے۔''

ان آیات سے محسنوں کی تین صفات اُبھر کر سامنے آتی ہیں: صبر، راہِ خدا میں جہاد اور دعا۔ ان کی تمام سرگرمیاں اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ وہ اس راہ کی مشکلات و مصائب میں صبر کرتے ہیں۔ ان کے دل میں اس سرگرمی کے باوجود عُجب و خود پسندی پیدا نہیں ہوتی اور ہمیشہ اپنی کوتاہیوں پر نگاہ رہتی ہے۔ وہ خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنی کوتاہیوں کی معافی طلب کرتے رہتے اور ان کے دل خدا کے خوف سے بھرے ہوئے اور ان کی زبانیں اس کے ذکر سے تر رہتی ہیں۔

(۳)

صلہ رحمی

محاسن اخلاق کی تیسری چیز، جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے سورۂ نحل کی آیت (۹۰) میں دیا ہے، ایتاء ذی القربیٰ ہے۔ اس حسن خلق کی دوسری تعبیر صلہ رحمی سے کی جاتی ہے۔ گویا ایتاء ذی القربیٰ (قرابت مندوں کے حقوق کی ادائیگی) ایک عنوان ہے صلہ رحمی کا۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کر لینا مناسب ہے کہ عدل واحسان کے دو عمومی حکم کے بعد الگ سے صلہ رحمی کا ایک مخصوص حکم کیوں دیا گیا؟ جب کہ عدل و احسان میں صلہ رحمی بھی داخل تھی۔ اس سوال کا جواب امام رازیؒ نے یہ دیا ہے کہ 'احسان' جن وسیع حدود تک پھیلا ہوا ہے ان میں تعظیم لامر اللّٰہ (اللہ کے حکم کی تعظیم) اور شفقة علی خلق اللّٰہ (خدا کی مخلوق پر مہربانی) بھی داخل ہے۔ مخلوق خدا پر شفقت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل و اشرف صلہ رحمی ہے اسی لیے اللہ نے علیحدہ سے اس کا حکم دیا ہے۔ راقم الحروف اس میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہے کہ بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ صلہ رحمی مخلوق پر شفقت کی سب سے افضل قسم ہے، بلکہ اس کا درجہ یہ ہے کہ اگر عام طور سے لوگ اس سے غفلت برتنے لگیں تو معاشرے کی جڑیں ہل جائیں۔ کیوں کہ اس کے بغیر عدل و احسان محض ایک رسمی چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی معاشرہ ایک خاندان سے شروع ہوتا ہے اور پھر بہت سے خاندان مل کر قبیلہ اور قوم بن جاتے ہیں۔ خاندان ایک قطرہ ہے جو پھیل کر سمندر بن جاتا ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی قبیلہ یا قوم کے تمام خاندان صلہ رحمی سے خالی ہیں۔ نہ والدین اپنی اولاد کے ساتھ شفقت و رحمت کا برتاؤ کرتے ہیں، نہ اولاد اپنے والدین کے ساتھ برّ و صلہ اور اطاعت و احترام کا برتاؤ کرتی ہے۔ نہ بھائیوں کے درمیان اعانت و شفقت کا رشتہ قائم ہے۔ نہ چچا اور بھتیجوں میں اچھے تعلقات ہیں، نہ ماموں اور بھانجے ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں اور نہ شوہر اور بیوی

کے تعلقات میں حسن سلوک کی شیرینی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پورا قبیلہ اور پوری قوم عدل و احسان، مرحمہ و مواساۃ اور فیاضی و رحم دلی سے خالی ہے۔ ایسی قوم جنگلی جانوروں کا ریوڑ تو کہی جاسکتی ہے، لیکن اسے انسانی سوسائٹی کا معزز نام نہیں دیا جاسکتا۔ ایتاء ذی القربیٰ کے حکم کو عام عدل واحسان کے حکم سے علیحدہ کرنے کی یہ ایک بڑی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اہمیت کو نمایاں کرنے کی ایک اور وجہ معلوم ہوتی ہے۔ زندگی بسر کرنے کے ذرائع و وسائل میں اشتراک اور نسل کی بقاء وارتقاء کے لیے گہرے تعلقات عام طور سے قرابت مندوں ہی کے درمیان ہوتے ہیں۔ رہنے کے مکان میں اشتراک، زمین اور جائداد میں اشتراک، تجارتی و صنعتی کاروبار میں اشتراک، نیز شادی بیاہ کے تعلقات، اجنبی لوگوں کے درمیان کم اور قرابت مندوں کے درمیان بہت زیادہ ہوتے ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو انسانوں کے درمیان جھگڑے ٹنٹے اور کشاکش و کش مکش کا سبب بھی بنتی ہیں۔ یہ بات کم یاب نہیں ہے کہ لوگوں کے تعلقات غیر رشتہ داروں سے اچھے اور رشتہ داروں سے کشیدہ ہوتے ہیں، اس کا سبب مفادات میں اشتراک ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ صلہ رحمی کے لیے علیحدہ سے مزید تاکیدی احکام دیے جائیں اور اس کی اہمیت اچھی طرح واضح کی جائے۔ چناں چہ جب ہم کتاب وسنت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کے حق کے بعد سب سے زیادہ قرابت مندوں کے حقوق کی ادائیگی یعنی صلہ رحمی پر زور دیا گیا ہے۔

سورۂ نحل کی اس آیت کے علاوہ متعدد دوسری آیتوں میں ہمیں یہ حکم ملتا ہے۔ سورۂ روم میں یہ حقیقت سمجھانے کے بعد کہ رزق کی تنگی و کشادگی تمام تر اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے، فرمایا گیا ہے:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (الروم:۳۸)

''پس (اے مومن) رشتہ دار کو اس کا حق دے۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کے بعد فرمایا: وَ اٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّهٗ (بنی اسرائیل:۲۶) ''اور رشتہ دار کو اس کا حق دے۔''

صلہ رحمی کا حکم دیتے ہوئے 'حق' کا لفظ استعمال کر کے انسان کو اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ رشتہ داروں کی جانی و مالی امداد اور ان کے ساتھ حسن سلوک کر کے اس کے دماغ میں یہ

خیال پیدا نہ ہو کہ وہ ان کے ساتھ احسان کر رہا ہے، جس کے بعد انہیں اس کے سامنے سر جھکا کے رہنا چاہیے، وہ چوں کہ دینے والا ہے اس لیے سربلند ہے اور رشتہ دار چوں کہ لینے والے ہیں، اس لیے اس کے مقابلے میں پست اور حقیر ہیں، بلکہ یہ خیال کرنا چاہیے کہ وہ جو کچھ دے رہا ہے ان کا حق دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ضرورت سے زیادہ مال اسی لیے دیا ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کا حق بھی ادا کرے۔ اگر ادا نہیں کرے گا تو خلق اور خالق دونوں کی نگاہ میں ناشکرا قرار پائے گا۔ سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل سے لیے ہوئے پختہ عہد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے حق کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد والدین کے حق کا اور تیسرے نمبر پر دوسرے رشتہ داروں کے حق کا۔ فرمایا گیا ہے:

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى (البقرۃ:۸۳)

”یاد کرو اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ اور رشتہ داروں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔“

سورۂ بقرہ ہی میں ایک جگہ حقیقی نیکی کی تفصیل کرتے ہوئے اللہ، آخرت، ملائکہ، آسمانی کتابوں اور انبیاء پر ایمان کے بعد سب سے پہلی جس نیکی کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى (البقرۃ:۱۷۷)

”اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں پر خرچ کرے۔“

سورۂ نسآء میں اللہ اور والدین کے حق کے بعد دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ (آیت ۳۶)

بدسلوکی کے باوجود صلہ رحمی کا حکم

صلہ رحمی کا یہ حکم کچھ اس بات پر موقوف نہیں رکھا گیا کہ رشتہ داروں کی طرف سے بھی صلہ رحمی اور حسن سلوک کا برتاؤ ہو، بلکہ ہدایت یہ کی گئی ہے کہ رشتہ داروں کی طرف سے بدسلوکی بھی ہو تو انسان ان کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

سورۂ نور میں فرمایا گیا:

وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْۤا اُولِی الْقُرْبٰی وَ الْمَسٰکِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لْیَعْفُوْا وَ لْیَصْفَحُوْاؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۝ (النور:۲۲)

"اور تم میں سے جو صاحبِ فضل اور صاحبِ مقدرت ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ رشتہ دار، مسکین اور مہاجر فی سبیل اللہ لوگوں کی امداد نہ کریں گے، انہیں معاف کر دینا اور درگزر کرنا چاہیے، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری مغفرت فرمائے۔ اللہ بہت بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔"

صحیح سندوں سے حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ "جب میری برأت اللہ کی طرف سے نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قسم کھائی کہ اب آئندہ وہ مسطح بن اثاثہؓ کو نہ خرچ دیں گے اور نہ ان کو کسی طرح کا کوئی نفع پہنچائیں گے۔ حضرت مسطح ان کے خالہ زاد بھائی تھے اور مسکین ہونے کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ ان کی کفالت فرماتے تھے۔ وہ مہاجر بھی تھے اور غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے، لیکن شیطانی اغوا کی وجہ سے واقعۂ افک میں یہ بھی مبتلا ہو گئے تھے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے ان کی کفالت ترک کر دینے کی قسم کھائی تو سورۂ نور کی مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ یہ آیت سن کر انہوں نے فرمایا: "ہاں، بخدا ہم ضرور اس کو پسند کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو ہماری مغفرت فرمائے۔" اس کے بعد انہوں نے حضرت مسطح کی پہلے کی طرح کفالت شروع کر دی، بلکہ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ پہلے سے زیادہ انہیں خرچ دینے لگے۔ (بخاری) حضرت ابن عباسؓ اور دوسرے مفسرین قرآن سے روایت آتی ہے کہ صرف حضرت صدیقؓ نہیں، متعدد صحابہ نے قسم کھائی تھی کہ اپنے ان قرابت مندوں سے صلہ رحمی نہیں کریں گے جنھوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ پر بہتان میں حصہ لیا تھا اور یہ آیت سن کر سبھوں نے اپنی قسم توڑ دی۔ (تفسیر طبری)

اس آیت کے سبب نزول سے متعدد باتیں معلوم ہوئیں، جن میں سب سے نمایاں بات یہی ہے کہ قرابت مندوں کی طرف سے بدسلوکی ہو تب بھی ان سے قطع رحم صحیح نہیں ہے، بلکہ ان سے صلہ رحمی کا برتاؤ جاری رکھنا چاہیے۔ اگر کوئی عزیز و قریب اپنے کسی قرابت مند کی عزت و آبرو پر حرف زنی شروع کر دے تو اس سے بڑی بدسلوکی اور کیا ہوگی۔ لیکن اس بدسلوکی کے باوجود اللہ رب العزت نے ہدایت فرمائی کہ ایسے شخص کو معاف کر دیا جائے، اس سے درگزر کیا جائے اور

صلہ رحمی سے منہ نہ موڑا جائے۔ جن الفاظ اور جس انداز میں یہ ہدایت اتری ہے اسے سمجھ کر ہر مومن مخلص کی زبان سے وہی بات نکلنی چاہیے جو حضرت صدیقؓ کی زبان سے نکلی اور اس کا رویہ وہی ہونا چاہیے جو صحابۂ کرام نے اختیار فرمایا۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی غفاری و ستاری اور اس کی رحمت پر غور کرو، وہ قادر مطلق ہونے کے باوجود اپنی شان میں گستاخی کرنے والوں کی روزی کبھی دنیا میں بند نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ اس بات پر بھی غور کرو کہ تم بھی معصوم نہیں، تم سے بھی قصور ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے تو کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہارے قصور کو معاف کر دے؟ ان دو باتوں کو سمجھ لینے کے بعد بھی اگر کوئی مسلمان کسی قصور وار قرابت مند سے ترک تعلق پر اصرار کرتا ہے تو اسے اپنے ایمان کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر یہ ہدایت ہم مسلمانوں کے قلب میں اتری ہوئی ہوتی اور ہم اس پر عمل پیرا بھی ہوتے تو ہمارے خاندانی تعلقات میں وہ بدمزگی موجود نہ ہوتی جو آج سیکڑوں خاندانوں میں موجود ہے۔ سورۂ نساء، جس کا بڑا حصہ مسلم معاشرے کی تنظیم و تعمیر کے احکام پر مشتمل ہے، اس کی بالکل ابتدائی آیتوں میں صلہ رحمی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور حقوق اللہ کے بعد اس کی نگہداشت کا حکم دیا گیا ہے:

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا۝ (النسآء:۱)

''اور اس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق مانگتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو، یقین جانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے۔''

اس آیت میں قطعِ رحم کی شناعت اور صلہ رحمی کی اہمیت پوری طرح نمایاں ہے۔ سورۂ رعد میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عقل مند اور فرماں بردار مندوں کی جو صفات بیان کی ہیں ان میں ایک یہ صفت ہے:

وَ الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ (الرعد:۲۱)

''وہ لوگ جنہیں اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انہیں برقرار رکھتے ہیں۔''

اس حکم عام میں صلہ رحمی کا حکم بدرجۂ اولیٰ داخل ہے۔ اس کے ساتھ بے وقوف اور نافرمان بندوں کی جو صفتیں بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صفت یہ ہے:

وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ (البقرۃ:۲۷)

''جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔''

قطع رابطہ کے اس عموم میں قطع رحم بھی یقیناً داخل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قطع رحم کسی مومن مطیع کا کام نہیں ہوسکتا۔ یہاں قطع رحم کی مذمت آیت کے عموم میں داخل ہے اور سورۂ محمد کی آیت ۲۲ میں صراحتہً اس کی مذمت بیان کی گئی ہے۔

صلہ رحمی کی تاکید احادیث میں

کتاب اللہ میں ایتاء ذی القربیٰ اور صلہ رحمی کا جو حکم اور قطع رحم کی جو ممانعت وشناعت بیان کی گئی ہے اس کی توضیح وتشریح احادیث میں ملتی ہے۔ اس سلسلے کی تمام احادیث کا استقصاء مقصود نہیں، ایک ترتیب سے چند احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

صلہ رحمی، دعوت اسلامی کے ابتدائی نکات میں

صلہ رحمی کی اہمیت کا ایک نمایاں رخ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو نبوت کے ابتدائی ایام میں جن چیزوں کی تبلیغ کا حکم دیا تھا ان میں صلہ رحمی بھی داخل تھی۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ كُنْتُ وَ اَنَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ اَظُنُّ اَنَّ النَّاسَ عَلٰی ضَلَالَةٍ وَ اِنَّهُمْ لَيْسُوْا عَلٰی شَيْءٍ وَ هُمْ يَعْبُدُوْنَ الْاَوْثَانَ فَسَمِعْتُ بِرَجُلٍ بِمَكَّةَ يُخْبِرُ اَخْبَارًا فَقَعَدْتُ عَلٰی رَاحِلَتِيْ فَقَدِمْتُ عَلَيْهِ فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مُسْتَخْفِيًا جُرَءَاءَ عَلَيْهِ قَوْمُهٗ فَتَلَطَّفْتُ حَتّٰی دَخَلْتُ عَلَيْهِ بِمَكَّةَ فَقُلْتُ لَهٗ مَا اَنْتَ؟ قَالَ اَنَا نَبِيٌّ فَقُلْتُ مَا نَبِيٌّ؟ قَالَ اَرْسَلَنِيَ اللّٰهُ فَقُلْتُ بِاَيِّ شَيْءٍ اَرْسَلَكَ؟ قَالَ اَرْسَلَنِيْ بِصِلَةِ الْاَرْحَامِ وَ كَسْرِ الْاَوْثَانِ وَ اَنْ يُّوَحَّدَ اللّٰهُ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْءٌ. (مسلم)

''حضرت عمرو بن عبسہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں جاہلیت ہی کے زمانے میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ لوگ گم راہی میں مبتلا ہیں اور جب وہ بت پوج رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خیر و صلاح کا کوئی حصہ ان کے پاس باقی نہیں ہے۔ اسی اثناء میں مجھے خبر ملی کہ مکہ میں کوئی شخص نئی باتیں بیان کرتا ہے۔ چناں چہ میں اپنی اونٹنی پر سوار ہوا اور مکہ پہنچا۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ چھپے چھپے رہتے تھے اور ان کی قوم ان پر چرب اور جری تھی۔ میں نے آپ تک پہنچنے کی ایک لطیف تدبیر اختیار کی، یہاں تک کہ آپ کے پاس پہنچ گیا اور پوچھا کہ آپ کس طرح کے آدمی ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا: میں نبی ہوں۔ میں نے کہا: نبی کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: مجھے اللہ نے اپنا

پیغام دے کر بھیجا ہے۔ پھر میں نے پوچھا: کس چیز کے ساتھ آپ کو بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا: مجھے اللہ نے بھیجا ہے صلہ رحمی کی تبلیغ کے لیے، بتوں کی شکست و ریخت کے لیے اور اس بات کے لیے کہ لوگ اللہ کی توحید کا اس طرح اقرار کریں کہ اس کے ساتھ کوئی شے شریک نہ کی جائے۔''

یہ حضرت عمرو بن عبسہؓ کی ایک طویل حدیث ہے، جس کے ابتدائی حصے یہاں نقل کیے گئے ہیں۔

اس حدیث نے صلہ رحمی کی اہمیت کو جس درجہ بڑھا دیا ہے وہ کسی اہلِ نظر سے مخفی نہیں رہ سکتی۔ یہاں صلہ رحمی کو بت شکنی اور توحید کی دعوت سے بھی پہلے ذکر کیا ہے۔ یہ لطیف اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ بت شکنی اور شرک کا استیصال صلہ رحمی کے خلاف نہیں، اس کے عین مطابق ہے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اسی کا تقاضا ہے۔ اس سے بڑی کوئی صلہ رحمی نہیں ہو سکتی کہ انسان اپنے رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے بچانے کی سعی کرے، اس لیے نبی ﷺ اپنی قوم کو جو دعوت دے رہے تھے وہ اس کے ساتھ سب سے بڑا احسن سلوک تھا، لیکن سردارانِ قریش اپنی حماقت سے یہ سمجھ رہے تھے بلکہ علی الاعلان کہہ رہے تھے کہ محمد (ﷺ) اپنی دعوت سے ہمارے رشتوں کو کاٹ رہے ہیں اور خاندان میں انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ حضرت عمرو بن عبسہؓ کو اپنی رسالت کے چند نکات بتاتے ہوئے صلہ رحمی کو مقدم کرنا ان کے الزام کا بڑا لطیف جواب تھا۔

اس حدیث کی تائید اس متفق علیہ حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ہرقل اور ابوسفیان کی گفتگو کا ذکر ہے۔ ہرقل نے ایک سوال کیا تھا کہ یہ مدعیٔ نبوت تمہیں کن چیزوں کا حکم دیتے ہیں؟ اس کے جواب میں ابوسفیان نے کہا تھا:

يَقُولُ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لاَ تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَ اتْرُكُوا مَا يَقُولُ آبَاؤُكُمْ وَ يَأْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ. (بخاری ومسلم)

''وہ کہتے ہیں کہ اے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور تمہارے باپ دادا جو کچھ کہا کرتے تھے اسے چھوڑ دو اور وہ ہمیں حکم دیتے ہیں نماز کا، سچائی کا، عفت و پارسائی کا اور صلہ رحمی کا۔''

حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی تھی اس میں بھی کہا تھا کہ نبی ﷺ ہمیں صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں: وَ اَمَرَنَا بِصِدْقِ الْحَدِيْثِ وَ اَدَاءِ الْاَمَانَةِ وَ صِلَةِ الرَّحِمِ وَ حُسْنِ الْجِوَارِ الخ (صحیح ابن خزیمہ) ''انہوں نے ہمیں حکم دیا سچ بولنے کا، امانت ادا کرنے کا، صلہ رحمی کا

اور اچھے پڑوس کا۔" یہ تمام احادیث ہمیں بتاتی ہیں کہ مکارمِ اخلاق میں صلہ رحمی کا درجہ کیا ہے؟ اور اس سوال کا صریح جواب بھی احادیث میں موجود ہے۔

صلہ رحمی کا درجہ اللہ کے نزدیک

اللہ نے صلہ رحمی کا جو حکم دیا ہے اس کا درجہ کیا ہے؟ اسے ذیل کی احادیث میں دیکھئے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهِ عَلَیْهِ وَ سَلَّمَ اَلرَّحِمُ شَجْنَةٌ مِنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰهُ مَنْ وَصَلَکِ وَ صَلْتُهٗ وَ مَنْ قَطَعَکِ قَطَعْتُهٗ. (بخاری)

"ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رشتہ داری خدائے رحمٰن کے آثارِ رحمت میں سے ایک اثر ہے تو اللہ اس سے فرماتا ہے: جو تجھے جوڑے گا میں اس کو اپنی رحمت سے جوڑے رکھوں گا اور جو تجھے کاٹے گا میں اس کو اپنی رحمت سے کاٹ دوں گا۔"

دوسری حدیث میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَهُ اللّٰهُ وَ مَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَهُ اللّٰهُ. (بخاری و مسلم)

"حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رشتہ داری عرشِ الٰہی کو تھامے ہوئے دعا کرتی رہتی ہے: جو مجھے جوڑے، اللہ اسے جوڑے اور جو مجھے کاٹے اللہ اسے کاٹے۔"

تیسری حدیث میں ہے:

عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی اَنَا اللّٰهُ وَ اَنَا الرَّحْمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَ شَقَقْتُ لَهَا مِنْ اِسْمِیْ فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهٗ وَ مَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهٗ. (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)

"حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کہتے ہوئے سنا: اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے: میں اللہ ہوں، میں رحمٰن ہوں، میں نے رحم (رشتہ داری) کو پیدا کیا اور اس کے لیے اپنے نام میں سے ایک نام منتخب کیا۔ جو اسے جوڑے گا میں اس کو اپنی رحمت سے جوڑوں گا اور جو اسے کاٹے گا میں اس کو اپنی رحمت خاص سے کاٹ دوں گا۔"

یہ احادیث جس حقیقت کی تعبیر ہیں وہ یہ ہے کہ اللہ نے صلہ رحمی کا جو امر فرمایا ہے اور قطع رحم

سے جو نہی فرمائی ہے تو یہ امر و نہی فقہی اصطلاح میں استحباب و کراہت کے دائرے میں داخل نہیں ہے، بلکہ فرض و حرام کے دائرے میں داخل ہے۔ صلہ رحمی فرض ہے اور قطع رحم حرام ہے۔ صلہ رحمی انسان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قریب کرتی اور قطع رحم اس کو رحمت خداوندی سے دور پھینک دیتا ہے۔

اجمالی طور پر صلہ رحمی کے وجوب اور قطع رحم کی حرمت پر تمام علماء متفق ہیں۔ اس کی مزید تفصیل آئندہ فقہ کی فصل میں آ رہی ہے۔

صلہ رحمی، رسولِ خداؐ کی نمایاں صفت

صلہ رحمی کا تعلق دراصل انسانی اخلاقیات سے ہے، جسے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان ترقی دے کر درجۂ کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ اسی لحاظ سے یہ انبیاء کرام علیہم السلام کی نمایاں ترین صفات میں سے ایک ہے۔ خاص طور پر سیدنا محمد ﷺ کے بارے میں معلوم ہو چکا کہ آپ نے ابتدائے نبوت ہی سے اس کی تبلیغ شروع کر دی تھی اور جہاں تک حضورؐ کے عمل کا تعلق ہے، نبوت سے پہلے بھی صلہ رحمی آپ کی نمایاں ترین صفات میں سے ایک صفت تھی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل حضرت خدیجہؓ کا وہ اظہار خیال ہے جو حضورؐ کی بعثت کے بعد انہوں نے کیا تھا۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ پہلی وحی کے بعد حضورؐ پر ایک قسم کی گھبراہٹ طاری ہوئی تھی اور جب آپؐ نے نزولِ وحی اور اپنے اندیشے کا ذکر حضرت خدیجہؓ سے کیا تو انہوں نے بڑی فصیح و بلیغ زبان میں حضورؐ کی چند نمایاں صفات کا ذکر کیا۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سب سے پہلے جس صفت کا ذکر کیا وہ صلہ رحمی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

كَلَّا وَ اللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ اَبَدًا اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَ تَصْدُقُ الْحَدِيْثَ (بخاری و مسلم)

"ہرگز نہیں، بخدا اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں اور سچ بولتے ہیں۔"

جب نبوت سے پہلے بھی صلہ رحمی آپؐ کی نمایاں صفت تھی تو کھلی بات ہے کہ نبوت کے بعد اس میں ترقی ہوئی ہوگی اور وہ درجۂ کمال تک پہنچ گئی ہوگی۔ کیوں کہ آپ کی بعثت کی غرض مکارم اخلاق کی تکمیل تھی، جیسا کہ گزشتہ صفحات میں اس پر تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ مکہ معظمہ میں قبل نبوت آپؐ کی صلہ رحمی کا ایک واقعہ ابن ہشام نے تھوڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے:

''اللہ تعالیٰ نے علی بن ابی طالبؓ پر جو احسانات کیے ہیں ان میں کا ایک احسان یہ ہے کہ وہ اسلام سے پہلے ہی رسول اللہ ﷺ کی آغوش تربیت میں پہنچ گئے تھے۔ واقعہ یوں ہوا کہ قریش سخت قحط میں مبتلا ہو گئے اور ابو طالب کثیر العیال شخص تھے۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے عم محترم حضرت عباسؓ سے جو بنو ہاشم میں سب سے زیادہ خوش حال شخص تھے، فرمایا: اے چچا! آپ کے بھائی ابو طالب کثیر العیال شخص ہیں اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کتنے سخت قحط میں مبتلا ہیں۔ آیئے میرے ساتھ، ہم ان کے پاس چلیں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ اپنی اولاد میں سے ایک کو میری کفالت میں دے دیں اور ایک کو آپ کی کفالت میں۔ اس طرح ہم ان کا بار کچھ کم کر دیں۔ حضرت عباسؓ تیار ہو گئے، چناں چہ دونوں ابو طالب کے پاس پہنچے اور کہا: ہم چاہتے ہیں کہ قحط دور ہونے تک آپ کا بار کچھ کم کریں اور وہ اس طرح کہ آپ کی اولاد میں سے دو کی کفالت ہم لوگ کریں۔ انہوں نے کہا: عقیل چھوڑ کر تم لوگ جسے لے جانا چاہتے ہو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنے کنبے میں داخل کر لیا اور حضرت عباسؓ نے حضرت جعفرؓ کی کفالت سنبھال لی۔ حضرت علیؓ رسول خدا کی بعثت تک آپ کے ساتھ رہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرمائی تو حضرت علیؓ آپ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کی۔ اس وقت ان کی عمر دس سال تھی۔ اسی طرح حضرت جعفرؓ حضرت عباسؓ کے ساتھ رہے، یہاں تک کہ اسلام لائے اور پھر ان کی کفالت سے مستغنی ہو گئے۔'' (سیرت ابن ہشام)

نبوت و رسالت کی بعد اس عظیم ترین ذمہ داری نے تمام اوقات گھیر لیے اور آپ کے پاس کسب معاش کے لیے کوئی وقت نہ چھوڑا۔ یہ حالت ابتدائے نبوت سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک یکساں قائم رہی۔ آخر جس خدا نے آپ پر یہ ذمہ داری ڈالی تھی اس نے جب مالِ غنیمت (دشمن پر حملے کی بعد جو مال لڑائی میں ہاتھ آتا ہے) اور فے (دشمن سے جو مال بغیر جنگ کے ہاتھ آتا ہے) کے احکام نازل فرمائے تو صراحت کے ساتھ اپنے حبیب کے اہلِ قرابت کا حصہ خود متعین فرمایا، تا کہ آپ صلہ رحمی اور ایتاءِ ذی القربیٰ کے فرض سے عہدہ برآ ہوں۔ سورۂ انفال میں فرمایا:

وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا غَنِمۡتُمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوۡلِ وَ لِذِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنِ وَ ابۡنِ السَّبِیۡلِ (الانفال: ۴۱)

''اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مالِ غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔''

اس آیت میں رشتہ داروں سے مراد حضورؐ ہی کے رشتہ دار ہیں۔ سورۂ حشر میں ارشاد ہوا:

مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَ لِذِى الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (الحشر:۷)

''جو مال لوٹا دیا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں کے، سو اللہ کے واسطے اور رسول کے اور قرابت والوں اور یتیموں کے اور محتاجوں کے اور مسافروں کے۔''

ان آیتوں کے بعد مالِ غنیمت کے پانچویں حصے سے اور مالِ فے سے حضور ﷺ اپنے رشتہ داروں کو دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ حضورؐ نے اپنے قرابت مندوں کے ساتھ، جنہوں نے آپ کی دشمنی اور ایذا رسانی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، متعدد مواقع پر جس شفقت و رحمت اور صلہ رحمی کا برتاؤ کیا وہ تاریخ کے مشہور واقعات ہیں اور فتح مکہ کے بعد اپنے دشمن اہلِ قرابت کے معاملے میں جس عالی ظرفی اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا وہ صلہ رحمی کی سب سے بلند چوٹی ہے، جسے پڑھ کر دشمنانِ اسلام بھی آپ کی وسعتِ ظرف کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتے۔

صلہ رحمی ایمان کا تقاضا

اوپر کی تفصیل سے خود یہ بات واضح ہے کہ ایک مومن کے لیے صلہ رحمی صرف طبعی محبت ہی کا تقاضا نہیں ہے، بلکہ اس کے ایمان کا تقاضا بھی ہے۔ یہ بات احادیث میں صراحۃً بھی آئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے:

وَ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ (بخاری و مسلم)

''اور جو شخص اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتا ہے اسے صلہ رحمی کرنی چاہیے۔''

صلہ رحمی گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلاً اَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اَصَبْتُ ذَنْبًا عَظِيْمًا فَهَلْ لِيْ مِنْ تُوْبَةٍ قَالَ هَلْ لَكَ مِنْ اُمٍّ قَالَ لَا قَالَ وَ هَلْ لَكَ مِنْ خَالَةٍ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَبِرَّهَا (مشکوۃ بحوالہ ترمذی)

''ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے پاس آ کر کہا: یارسول اللہ مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے، تو کیا میرے لیے اس سے تائب ہونے کی کوئی صورت ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا کوئی خالہ زندہ ہے؟ اس نے کہا: ہاں، آپؐ نے فرمایا: اس سے نیک سلوک کرو (صلہ رحمی کرو)۔''

دخولِ جنت کا سبب

ہر خیر دخولِ جنت اور ہر شر دخولِ جہنم کا سبب بن سکتا ہے۔ احادیث میں جن نیکیوں کو دخولِ جنت کا سبب اور جن برائیوں کو دخول نار کا سبب کہا گیا ہے، ان کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔

عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اِنَّ رَجُلاً قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ تَعْبُدُ اللّٰہَ وَ لاَ تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا وَ تُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ وَ تُؤْتِی الزَّکٰوۃَ وَ تَصِلُ الرَّحِمَ۔ (متفق علیہ)

''ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے۔ ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ! مجھے ایسا عمل بتائیے جو مجھے جنت میں داخل کرے، نبی ﷺ نے فرمایا: تم اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور صلہ رحمی کرو۔''

اس حدیث سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی ان اعمال میں سے ہے جو دخولِ جنت کا سبب ہیں اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حق اللہ کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق رشتہ داروں کا ہے۔ اسی تقدم کا اثر ہے کہ دوسرے حاجت مند لوگوں کی مالی امداد کے مقابلے میں رشتہ داروں کی مالی امداد کا دُہرا اجر ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

رشتہ داروں کی مالی امداد کا دُہرا اَجر

حضرت سلمانؓ کی حدیث کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اَلصَّدَقَۃُ عَلَی الْمِسْکِیْنِ صَدَقَۃٌ وَ عَلٰی ذِی الرَّحِمِ ثِنْتَانِ: صَدَقَۃٌ وَ صِلَۃٌ۔ (ترمذی)

''نبی ﷺ نے فرمایا: مسکین پر صدقہ بس ایک صدقہ ہے اور رشتہ دار پر صدقہ دو چیزیں بن جاتا ہے: صدقہ بھی اور صلہ رحمی بھی۔''

یہی بات ام المومنین حضرت میمونہؓ کی حدیث میں ملتی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنی ایک لونڈی آزاد کردی اور نبی ﷺ کو اطلاع نہ دے سکی۔ جب باری کے دن نبی ﷺ میرے یہاں تشریف لائے تو میں نے کہا: یارسول اللہ! کیا آپ نے محسوس فرمایا میں نے اپنی لونڈی آزاد کردی۔ آپ نے کہا: کیا تم نے اسے آزاد کردیا؟ میں نے کہا: ہاں! اس کے بعد حضورؐ نے جو

جملہ فرمایا وہ یہ تھا:

اَمَا اَنَّکِ لَوْ اَعْطَيْتِهَا اَخْوَالَکِ کَانَ اَعْظَمَ لِاَجْرِکِ (بخاری ومسلم)

''اگر تم اسے اپنے ماموؤں کو دے دیتیں تو تمہارا اجر بڑھ جاتا۔''

لونڈی، غلام آزاد کرنا بڑے اجر کا کام ہے، لیکن اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرابت مندوں کی ضرورت پوری کرنا اس سے بھی بڑے اجر کا کام ہے۔ یہی مشورہ آپ نے حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کو دیا تھا، جب انہوں نے اپنے بہترین باغ بیرحاء کو فی سبیل اللہ صدقہ کرنا چاہا۔ آپ نے ان سے فرمایا کہ میری رائے ہے کہ تم اسے اپنے اہلِ قرابت کو دے دو۔ چناں چہ انہوں نے اس مشورے کو قبول کرتے ہوئے اس باغ کو اپنے چچا کی اولاد اور دوسرے قرابت مندوں میں تقسیم کر دیا۔

صلہ رحمی سے روزی اور عمر میں اضافہ

اوپر صلہ رحمی کے اخروی اجر کا بیان تھا۔ اب اس نیکی کے دنیوی فائدے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ دنیا اصلاً دارالجزاء نہیں، بلکہ دارالعمل ہے، اس لیے نیکیوں پر دنیا میں کوئی اجر ملتا نہ دکھائی دے تب بھی اجر آخرت پر یقین رکھنے والے لیے شکایت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن یہ اللہ کا کرم ہے کہ وہ نمونے کے طور پر اس دنیا میں بھی نیکیوں کا صلہ عطا فرماتا ہے۔

عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّبْسَطَ لَهٗ فِیْ رِزْقِهٖ وَ يُنْسَاَ لَهٗ فِیْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ. (بخاری)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے یہ بات پسند ہو کہ اس کا رزق وسیع اور اس کی عمر طویل ہو تو اسے صلہ رحمی کرنی چاہیے۔''

یہ تعبیر ہے اس بات کی کہ صلہ رحمی یعنی رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے اور ان کے ساتھ نیک سلوک کا دنیوی فائدہ یہ ہے کہ اس سے رزق اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے جو روایت کی ہے اس میں ایک فائدہ کا اور اضافہ ہے، وہ یہ کہ صلہ رحمی اہلِ خاندان میں محبت کا سبب ہے۔ صلہ رحمی کرنے والا اپنے اہلِ قرابت کا محبوب ہوتا ہے۔ رزق میں زیادتی، عمر میں زیادتی اور اہل خاندان کی محبت، دنیاوی نعمتوں میں یہ کتنی بڑی نعمتیں ہیں اور کون نہیں چاہتا کہ اسے یہ نعمتیں حاصل ہوں۔

حقیقی صلہ رحمی

صلہ رحمی کی ایک قسم تو بدلے کی صلہ رحمی ہے، یعنی میرے قرابت مند میرے ساتھ حسنِ سلوک کر رہے ہیں تو بدلے میں ان کے ساتھ میں بھی نیک برتاؤ کروں۔ صلہ رحمی کی یہ قسم محض رسمی ہے۔ حقیقی صلہ رحمی یہ ہے کہ جب میرے قرابت مند بدسلوکی کر رہے ہوں اور رشتے کو کاٹ رہے ہوں تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کروں اور رشتے کو جوڑوں۔ اوپر آیت سورۂ نور کی تشریح میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ اللہ کی ہدایت اور اس کی مرضی یہ ہے کہ رشتہ داروں کی طرف سے بدسلوکی ہو تب بھی ان کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے۔ احادیث نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِي وَ لٰكِنَّ الْوَاصِلُ الَّذِيْ اِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا۔ (بخاری)

”عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: رشتہ جوڑنے والا وہ نہیں ہے جو بدلے میں ایسا کرتا ہے، بلکہ حقیقی صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس کا رشتہ کٹ جائے تو وہ اسے جوڑے۔“

افسوس کہ اس حقیقی صلہ رحمی کا وجود اب مسلم معاشرے میں بہت کم ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خاندانی اختلافات بے حد بڑھ گئے ہیں۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر شخص تعلقات کو بگاڑنے پر تلا بیٹھا ہے۔ حال یہ ہو گیا ہے کہ شادی بیاہ کی دعوتی فہرست میں ناموں کے تقدم و تاخر پر تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ برائی کے بدلے میں بھلائی اور قطع رحم کے جواب میں صلہ رحم کا تصور تک مٹتا جا رہا ہے۔ اس سلسلے کی ایک اور حدیث یہ ہے:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَجُلاً قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ قَرَابَةً اَصِلُهُمْ وَ يَقْطَعُوْنِيْ وَ اُحْسِنُ اِلَيْهِمْ وَ يُسِيْئُوْنَ اِلَيَّ وَ اَحْلُمُ عَنْهُمْ وَ يَجْهَلُوْنَ عَلَيَّ فَقَالَ لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ فَكَاَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ وَلاَ يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِيْرٌ عَلَيْهِمْ مَا دُمْتَ عَلٰى ذٰلِكَ۔ (مسلم)

”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا، یا رسول اللہ! میرے کچھ قرابت مند

ہیں۔ میں ان سے تعلق جوڑتا ہوں اور وہ مجھ سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ میں ان سے نیک سلوک کرتا ہوں اور وہ مجھ سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان سے حلم و بردباری کا برتاؤ کرتا ہوں اور وہ جہالت پر اتر آتے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا: اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہہ رہے ہو تو گویا تم انہیں گرم راکھ کھلا رہے ہو اور جب تک تم اپنی روش پر قائم رہو گے تمہارے ساتھ اللہ کی طرف سے ان کے مقابلے میں ایک مددگار رہے گا۔''

گرم راکھ کھلانے کی تشبیہ ان کے انجام کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمائی گئی ہے، یعنی جس طرح گرم راکھ کھانے سے تکلیف ہوتی ہے اسی طرح قطع رشتہ، بدسلوکی اور جہالت کا انجام ان کے لیے دردناک ہوگا۔ اس حدیث میں ''جب تک تم اپنی روش پر قائم رہو گے، ان کے مقابلے میں تمہارے ساتھ اللہ کی طرف سے ایک مددگار رہے گا۔'' کا ٹکڑا بدسلوکی کے جواب میں حسن سلوک کی روش پر قائم رہنے کے لیے بڑی ترغیب پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف ان بدمعاملہ رشتہ داروں کو اپنی روش سے توبہ کرنے کی طرف مائل کرتا ہے، جو اللہ کی قدرت اور جزا وسزا پر ایمان رکھتے ہیں۔

قطع رحم جنت سے محرومی کا سبب

پہلے کتاب اللہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ قطع رحم اصلاً کسی مسلم کی صفت نہیں ہو سکتی، بلکہ یہ خدا کے باغیوں اور منافقوں کی صفت ہے۔ احادیث سے بھی یہ معلوم ہو چکا کہ رشتے کو کاٹنا یعنی قرابت مندوں کے حقوق ادا نہ کرنا خدا کی رحمت سے دور کر دیتا ہے اور آخرت میں خدا کی رحمت کا مظہر جنت ہے۔ اس لیے اشارتاً یہ بات پہلے ہی آ چکی کہ قطعِ رحم جنت سے محرومی کا سبب ہے، لیکن بات اشارے تک محدود نہیں رکھی گئی، صراحۃً بھی اس صفتِ بد کو جنت سے محرومی کا سبب قرار دیا گیا ہے۔

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعُ رَحِمٍ. (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

''جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جنت میں رشتہ قطع کرنے والا داخل نہ ہوگا۔''

یہ سخت وعید جنت وجہنم پر ایمان رکھنے والے کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔

اعمالِ خیر کی نامقبولیت

اس بری خصلت کے ساتھ مومن کے اعمال خیر اللہ کے دربار میں قبول نہیں کیے جاتے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ اِنَّ اَعْمَالَ بَنِیْ آدَمَ تُعْرَضُ كُلَّ خَمِیْسٍ لَیْلَةَ الْجُمُعَةِ فَلاَ یُقْبَلُ عَمَلُ قَاطِعِ رَحِمٍ. (مسند احمد)

''ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: بنی نوع انسان کے اعمال ہر شب جمعہ کو پیش کیے جاتے ہیں تو رشتہ کاٹنے والے کا عمل قبول نہیں کیا جاتا۔''

نزولِ رحمت کا انقطاع

قطع رحم ایسی بری چیز ہے کہ نزول رحمت الٰہی کے منقطع ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ اَوْفٰی قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ لاَ تَنْزِلُ الرَّحْمَةُ عَلٰی قَوْمٍ فِیْهِ قَاطِعُ رَحِمٍ. (بیہقی)

''عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: اس قوم پر رحمت نازل نہیں ہوتی جس میں کوئی شخص قطع رحم کرنے والا ہو۔''

قطعِ رحم دنیوی سزا کا سبب ہے

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، دنیا اصلا دار الجزاء نہیں ہے، لیکن نمونے اور عبرت کے لیے اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی کبھی اعمال بد کی سزا دیتا ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ بدسلوکی بھی ان برے اعمال میں ہے جو عقوبت دنیا کا سبب بنتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ بَكْرَةَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ مَا مِنْ ذَنْبٍ اَجْدَرُ اَنْ یُّعَجِّلَ اللّٰهُ تَعَالٰی لِصَاحِبِهِ الْعُقُوْبَةَ فِی الدُّنْیَا مَعَ مَا یَدَّخِرُ لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْبَغْیِ وَ قَطِیْعَةِ الرَّحِمِ. (ابوداؤد و ترمذی)

''ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی مسلمان پر زیادتی وظلم اور قطعِ رحم سے زیادہ کوئی گناہ اس لائق نہیں کہ گنہگار کو دنیا میں بھی سزا دی جائے اور آخرت میں اس کے لیے جو عذاب تیار کیا گیا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔''

صلہ رحمی فقہ کی روشنی میں

کتاب وسنت کی تصریحات کے بعد صلہ رحمی کے وجود پر کسی فقہی استشہاد کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہاں ان تصریحات سے اس کی جو تفصیلات مستنبط ہوتی ہیں ان کے لیے فقہ کی یقیناً ضرورت ہے، لیکن میں پہلے مزید توثیق کے لیے وجوب وحرمت پر بھی فقہاء کی رائے پیش کرتا ہوں۔ متن تنویر الابصار اور اس کی شرح درمختار میں ہے:

و صلة الرحم واجبة و لو كانت بسلام و تحية و هدية و معاونة و مجالسة و مكالمة و تلطف و احسان و يزورهم غِبًّا ليزيد حبًّا بل يزور أقرباءه كل جمعة أو شهر و لاَ يردّ حاجتهم لانه من القطيعة.

(كتاب الحظر و الاباحة)

”صلہ رحمی واجب ہے، اگرچہ یہ سلام وتحیہ، ہدیہ ومعاونت، مجالست وگفتگو اور ملاطفت واحسان کے ذریعہ ہو اور اہل قرابت سے ملاقات کرتے رہنا چاہیے، تاکہ محبت میں اضافہ ہو، بلکہ ہر جمعہ یا ہر مہینے ان سے ملاقات کرنا چاہیے اور (بلا وجہ) ان کی حاجت تو رد نہ کرنا چاہیے، کیوں کہ ایسا کرنا صلہ رحمی کے خلاف ہے۔“

”وصلة الرحم واجبة“ کی تشریح میں علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

نقل القرطبی فی تفسیره اتفاق الأمة علی وجوب صلتها و حرمة قطعها الادلّة القطعية من الكتاب والسنة علىٰ ذلک، قال في تبيين المحارم و اختلفوا في الرحم التي يجب صلتها قال قوم هي قرابة كل ذی رحم محرم، و قال آخرون كل قريب محرماً كان او غيره الخ و الثانی ظاهر اطلاق المتن، قال النووی فی شرح مسلم و هو الصواب و استدلّ عليه بالأحاديث، نعم تتفاوت درجاتها ففي الوالدين اشد من المحارم، و فيهم اشد من بقية الْارحام، و في الحديث إشارة الى ذلک كما بيّنه في تبيين المحارم. (شامی، جلد ۵، ص ۴۰۶)

”قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ تمام امت مسلمہ صلہ رحمی کے وجوب اور قطع رحم کی حرمت پر

متفق ہے۔ اس لیے کہ اس کے بارے میں کتاب وسنت کے قطعی دلائل موجود ہیں۔ تبیین المحارم (فقہ کی ایک مستند کتاب کا نام) میں کہا ہے کہ فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ کن رشتہ داروں سے صلہ رحمی واجب ہے اور کن سے واجب نہیں ہے۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ جو رشتہ دار ایک دوسرے کے محرم ہوتے ہیں ان کے درمیان صلہ رحمی واجب ہے اور دوسری جماعت کہتی ہے کہ ہر رشتے سے صلہ رحمی واجب ہے، وہ محرم ہو یا نہ ہو (علامہ شامی لکھتے ہیں) دوسرا قول اس لیے مرجح ہے کہ متون فقہ میں کسی قید کے بغیر صلہ رحمی کو واجب کہا گیا ہے۔ نووی نے شرح مسلم میں دوسرے ہی قول کو صحیح قرار دیا ہے اور احادیث سے استدلال بھی کیا ہے۔ ہاں رشتہ داروں کے درجات متفاوت ہیں۔ والدین سے صلہ رحمی سب سے مقدم وموکد ہے اور ان کے بعد محارم (وہ رشتہ دار جو ایک دوسرے کے محرم ہوتے ہیں) کا درجہ ہے اور اس کے بعد دوسرے رشتہ داروں کا درجہ ہے اور احادیث میں اس درجہ بندی کی طرف اشارہ موجود ہے جس کی توضیح تبیین المحارم میں ہے۔''

میں نے یہ لمبا حوالہ عربی عبارت کے ساتھ اس لیے نقل کیا ہے کہ ان معاملات میں فقہی عبارتوں کی تصریحات بہت کم مقالات ومضامین میں نظر سے گزرتی ہیں۔ علامہ شامی نے درمختار کی مذکورہ عبارت کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے:

''تبیین المحارم میں لکھا ہے کہ اگر رشتہ دار کہیں دور رہتے ہوں تو ان کو خط لکھ کر ان سے ربط وتعلق قائم رکھنا چاہیے اور اگر وہاں پہنچ کر ان سے ملاقات پر قدرت ہو تو یہ افضل ہوگا۔ والدین کا معاملہ یہ ہے کہ اگر وہ خدمت کے محتاج ہوں یا خط پر اکتفا نہ کریں، بلکہ اپنی اولاد کو اپنے پاس بلائیں تو صرف خط لکھنا صلہ رحمی کے لیے کافی نہیں ہے اور بڑا بھائی باپ کے انتقال کے بعد صلہ رحمی میں باپ کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اسی طرح دادا اور اس کے اوپر کے رشتے اور بڑی بہن اور خالہ صلہ رحمی میں ماں کے مثل ہیں۔ اسی طرح چچا باپ کے مثل ہے۔ ان کے علاوہ جو رشتے دار ہیں ان کو خط لکھنا یا ان کے پاس ہدیہ بھیجنا صلہ رحمی کے لیے کافی ہے۔ پھر یہ بات بھی جان لو کہ صلہ رحمی سے مراد یہ نہیں ہے کہ جب رشتہ دار تم سے صلہ رحمی کریں تب تم ان سے صلہ رحمی کرو، کیوں کہ یہ تو مکافات اور بدلہ ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ جب وہ قطع رشتہ کریں تب تم ان سے رشتہ جوڑو اور ان کے حقوق ادا کرو، جیسا کہ بخاری کی حدیث میں ہے۔''

فقہاء کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فقہ میں صلہ رحمی کی حیثیت کیا ہے، بلکہ یہاں بات اتنے پر ختم نہیں ہو جاتی، آگے بڑھتی ہے۔

رشتہ داروں پر رشتہ داروں کی کفالت بھی واجب ہے

فقہ کی کتابیں اس مسئلے کی تفصیل سے بھی بھری ہوئی ہیں کہ کن رشتہ داروں پر کن رشتہ داروں کو خرچ دینا واجب ہے اور کن حالتوں میں واجب نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں وہ تمام تفصیلات پیش نہیں کی جاسکتیں۔ مسلم معاشرے میں عام طور سے اس وقت جو تصور باقی ہے وہ بس اتنا ہے کہ شوہر پر بیوی کی اور اولاد پر والدین کی کفالت واجب ہے، لیکن فقہاء بتاتے ہیں کہ معاملہ صرف اتنا نہیں ہے، بلکہ صلہ رحمی میں درجہ بدرجہ تمام رشتہ داروں کو خرچ دینا بھی داخل ہے۔ شرط یہ ہے کہ اہلِ قرابت ضرورت مند ہوں اور دینے والا خرچ دینے کی مقدرت و وسعت بھی رکھتا ہو۔ عام طور پر ہمارا مسلم معاشرہ اس وجوب کا احساس بھی نہیں رکھتا، الاّ ماشاء اللہ۔

رشتہ داروں کی درجہ بندی

اس بات کا ادراک تو عقل بھی کرلیتی ہے کہ تمام رشتہ داروں کے درجے ایک نہیں ہوسکتے۔ ان کے مدارج و مراتب میں یقیناً فرق ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ سب سے بڑا درجہ اسی کا ہونا چاہیے جو رشتہ میں سب سے زیادہ قریب ہے۔ احادیث نے اس عقلی ادراک کی تصدیق کرکے اسے شرعی حقیقت بنادیا ہے۔ رشتہ داروں کی درجہ بندی میں ذیل کی حدیث ایک اصلِ کلّی کی حیثیت رکھتی ہے:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ قَالَ اُمُّکَ ثُمَّ اُمُّکَ ثُمَّ اُمُّکَ ثُمَّ اَبُوْکَ ثُمَّ اَدْنَاکَ فَاَدْنَاکَ. (بخاری ومسلم)

”حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا: یارسول اللہ! میرے حسنِ سلوک کا کون سب سے زیادہ مستحق ہے؟ آپ نے تین بار فرمایا: تمہاری ماں، پھر فرمایا: تمہارا باپ، پھر ان کے بعد تمہارا اقریب ترین رشتہ دار۔“

ماں باپ کے ساتھ صلہ رحمی کی اہمیت اور اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ اس حدیث سے علماء و محدثین رشتہ داروں کی درجہ بندی پر استدلال کرتے ہیں اور یہ استدلال بالکل واضح ہے۔ ماں باپ کے علاوہ کچھ اور رشتہ داروں کا ذکر بھی صراحۃً احادیث میں آیا ہے۔ انہیں

بھی دیکھ لینا چاہیے:

كُلَيْبِ بْنِ مَنْفَعَةَ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَنْ اَبَرُّ قَالَ اُمَّکَ وَ اَبَاکَ وَاُخْتَکَ وَ اَخَاکَ وَ مَوْلَاکَ الَّذِیْ يَلِیْ ذٰلِکَ حَقٌّ وَاجِبٌ وَ رَحِمٌ مَوْصُوْلَةٌ. (ابوداؤد)

”کلیب بن منفعہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں کس کے ساتھ نیکی اور صلہ رحمی کروں؟ آپ نے فرمایا: اپنی ماں اور باپ کے ساتھ، بہن اور بھائی کے ساتھ اور اس رشتہ دار کے ساتھ جو ان سے قریب ہو۔ ان کے حقوق ادا کرنا اور ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا واجب ہے۔“

بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ بڑے بھائیوں کا حق چھوٹے بھائیوں پر وہی ہے جو باپ کا حق اپنی اولاد پر ہوتا ہے۔ اسی طرح صحیح حدیث میں چچا کو باپ کا مثل قرار دیا گیا ہے۔ ماموؤں کا ذکر اوپر حضرت میمونہؓ کی حدیث میں گزر چکا۔ خالہ کا درجہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْاُمِّ (ترمذی)

”براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: خالہ ماں کے درجے میں ہے۔“

اوپر گزر چکا کہ جس طرح ماں کے ساتھ حسن سلوک اور صلہ رحمی گناہ کا کفارہ بنتی ہے، اسی طرح خالہ کے ساتھ نیک سلوک گناہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ مال دار بیوی اگر ضرورت مند شوہر کی مالی امداد کرے تو اسے بھی دہرا اجر ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک ذرا لمبی حدیث آتی ہے۔ میں یہاں اس کا مفہوم پیش کرتا ہوں۔

”زینب ثقفیہؓ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی کہتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ صدقہ کرو، اگرچہ زیور ہی کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ یہ سن کر میں اپنے گھر گئی اور میں نے عبداللہ بن مسعود سے کہا: تم کم آمدنی والے شخص ہو اور رسول اللہ ﷺ نے ہم عورتوں کو صدقے کا حکم دیا ہے۔ تم جا کر ان سے پوچھو، اگر تم کو صدقہ دینے سے میرا فرض ادا ہو جاتا ہو تو تمہی کو دوں، ورنہ دوسروں کو دوں۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا: تم خود جا کر پوچھو۔ وہ گئیں اور دیکھا کہ حضور ﷺ کے دروازے پر ایک انصاری عورت بھی موجود ہے وہ کہتی ہیں کہ اس کی ضرورت بھی وہی تھی جو میری تھی۔ حضورؐ کی شخصیت میں اللہ نے ایک رعب اور ہیبت رکھ دی تھی۔ اس لیے ہم میں سے کسی کو براہِ راست پوچھنے کی جرأت نہ ہو رہی تھی کہ اتنے میں حضورؐ کے گھر سے بلال

نکلے۔ ہم نے ان سے کہا کہ جاؤ حضورؐ سے کہو کہ دروازے پر دو عورتیں کھڑی ہیں اور پوچھ رہی ہیں کہ اگر وہ اپنا صدقہ اپنے شوہروں کو اور ان یتیموں کو دے دیں جن کی وہ پرورش کر رہی ہیں تو کیا یہ ان کے لیے کافی ہو جائے گا۔ یہ نہ بتانا کہ ہم کون لوگ ہیں؟ حضرت بلالؓ حضورؐ کے پاس گئے اور سوال کیا۔ حضورؐ نے پوچھا: وہ دونوں کون ہیں؟ انہوں نے کہا: ایک انصاری عورت ہے اور ایک زینب ہیں۔ حضورؐ نے پوچھا: کون سی زینب؟ انہوں نے کہا: عبداللہ بن مسعود کی بیوی۔ تب رسول اللہؐ نے فرمایا: ان کے لیے دو اجر ہے: قرابت کا اجر اور صدقہ کا اجر۔" (بخاری و مسلم)

رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور حسن سلوک کا حکم انہی کے ساتھ ختم نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس قدر وسعت اختیار کرتا ہے کہ کسی ملک کے تمام باشندوں کے ساتھ نیک سلوک کا اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ اس ملک کے کسی ایک شخص سے رشتے کا تعلق تھا۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے صحابہ کرام سے فرمایا: عنقریب تم لوگ مصر فتح کرو گے تو باشندگان مصر کے لیے میری طرف سے نیک برتاؤ کی وصیت ہے۔ کیوں کہ وہ ذمی بھی ہوں گے اور ان سے رشتے کا بھی تعلق ہے۔ (مسلم) اس حدیث کی شرح میں علماء نے لکھا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ محترمہ حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں، اس لیے حضورؐ نے اہلِ مصر سے رشتہ داری کا ذکر فرمایا۔ یہ ہے صلہ رحمی کے بارے میں اسلامی شریعت کا نقطۂ نظر۔

باب پنجم

برے اخلاق جن سے اجتناب کرنا چاہیے

مکارمِ اخلاق کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک انسان اپنے آپ کو برے اخلاق سے پاک نہ کر لے۔ اچھے اخلاق کے حصول اور برے اخلاق کی نفی سے مومن کا ایمان درجۂ کمال تک پہنچتا ہے۔ بنیادی محاسن اخلاق کی تفصیل گزر چکی۔ اب بنیادی مساوی اخلاق (برے اخلاق) کی مختصر تشریح کی جا رہی ہے۔ سورۂ نحل کی آیت ۹۰ نے انہیں بھی تین الفاظ میں سمیٹ لیا ہے: فحشاء، منکر اور بغی۔ پوری آیت یہ ہے:

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْإِحْسَانِ وَ إِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النحل:۹۰)

''اللہ عدل، احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، ظلم اور زیادتی سے منع کرتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم سبق لو۔''

فحشاء، منکر اور بغی کی مختصر تشریح سے پہلے ایک دیدہ ور مفسر (مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ) کی تفسیر کا اقتباس ذیل میں دیا جا رہا ہے:

''پہلی چیز فحشاء ہے، جس کا اطلاق تمام بے ہودہ اور شرم ناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فحش ہے۔ مثلاً بخل، زنا، برہنگی، عریانی، عمل قوم لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان برے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے۔ مثلاً جھوٹا پروپیگنڈہ، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمائش کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز منکر ہے، جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے بالعموم انسان برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے برا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

تیسری چیز بغی ہے، جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔'' (تفہیم القرآن، ج ۲، ص ۵۶۶)

جس طرح عدل، احسان اور صلہ رحمی کی تین بھلائیاں انفرادی طور پر افراد و اشخاص کو اور اجتماعی طور پر پورے معاشرے کو درست کرتی ہیں، اسی طرح فحشاء، منکر اور بغی کی تین برائیاں فرد اور جماعت کو خراب کرنے والی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے پیدائشی طور پر انسان کو جو قوتیں عطا فرمائی ہیں ان میں ایک قوت تو وہ ہے جس سے وہ اپنے لیے جلبِ منفعت کرتا ہے۔ یہی قوت اسے لذت، مسرت اور نفع بخش چیزوں کی تحصیل پر آمادہ کرتی ہے۔ اس قوت کو فلاسفہ 'قوتِ شہوانیہ' کہتے ہیں۔ دوسری قوت وہ ہے جس سے وہ دفعِ مضرت کرتا ہے۔ یہی قوت اسے تکلیف دہ اور نقصان رساں چیزوں کی مدافعت پر ابھارتی ہے۔ اس کو 'قوتِ غضبیہ' کہا گیا ہے۔ تیسری قوت وہ ہے جو اسے اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں بلند کرنے اور اونچا رکھنے پر اکساتی ہے۔ اس کو 'قوت وہمیہ' سے تعبیر کرتے ہیں۔ امام رازیؒ کا خیال ہے کہ انسان قوتِ شہوانیہ کی بے اعتدالی سے فحشاء میں اور قوتِ غضبیہ کی بے اعتدالی سے منکر میں اور قوتِ وہمیہ کی بے اعتدالی سے بغی میں مبتلا ہوتا ہے۔ ان تین برائیوں سے روک کر اللہ نے انسان کو تینوں پیدائشی قوتوں کو حد اعتدال میں رکھنے کا حکم دیا ہے اور حد اعتدال کا معیار اسلامی شریعت ہے۔ جلبِ منفعت ہو یا دفعِ مضرت یا بلندیوں کے حصول کی خواہش، ہر موقع پر دیکھنا پڑے گا کہ شریعت کس چیز کی اجازت دیتی ہے اور کس چیز سے روکتی ہے۔ اس کی ممانعت پر رک جانا ہی اعتدال کی حد ہے۔ اگر کوئی شخص اس حد پر نہیں رکتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اللہ کی دی ہوئی قوتوں پر قابو حاصل نہیں کیا۔ امام رازیؒ کے خیال میں نکتہ آفرینی بے شک ہے لیکن یہ تینوں الفاظ فحشاء، منکر، بغی جہاں جہاں استعمال کیے گئے ہیں ان سب کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ فلسفیانہ تقسیم و حد بندی اطمینان بخش نہیں ہے۔ صحیح تر بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان تینوں بنیادی برائیوں کا صراحۃً ذکر کر کے ہر اس برائی سے روک دیا گیا ہے جس سے انفرادی و اجتماعی اخلاق میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ مثلاً فحشاء کا اطلاق صرف ان ہی برائیوں پر ہو جن کا تعلق قوتِ شہوانیہ سے ہوتا ہے، کیوں کہ ہم شرعی استعمال

میں ایسی برائی پر بھی فحش کا اطلاق دیکھتے ہیں جس کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے، بلکہ لغوی اطلاقات کے لحاظ سے بھی فحش، فاحشہ اور فحشاء کے استعمال میں وسعت وعموم پایا جاتا ہے۔

۱- فحشاء

مفردات امام راغب میں ہے:

الفحش والفحشاء والفاحشة ما عظم قبحه من الأفعال والأقوال

''فحش، فحشاء اور فاحشہ ہر ایسے قبیح قول وفعل کو کہتے ہیں جس کی قباحت اور برائی بہت بڑھی ہوئی ہو۔''

لسان العرب میں ہے:

الفحش والفحشاء والفاحشة القبيح من القول والفعل و جمعها الفواحش و الفحشاء اسم الفاحشة و في الحديث ان الله يبغض الفاحش المتفحش، الفاحش ذو الفحش والخنا من قول، و فعل والمتفحش الذي يتكلّف سبّ الناس و يتعمّده، و قد تكرر ذكر الفحش والفاحشة والفاحش في الحديث، و هو كل ما يشتدّ قبحه من الذنوب والمعاصي.

''فحش، فحشاء اور فاحشہ قبیح قول وفعل کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع فواحش ہے اور فحشاء، فاحشہ کا اسم ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ اللہ فاحش اور متفحش سے نفرت کرتا ہے۔ فاحش تو وہ شخص ہے جس کے قول وفعل میں فحش پایا جاتا ہے اور متفحش وہ ہے جو بالقصد اور بہ تکلف لوگوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ حدیث میں فحش، فاحشہ اور فاحش کا بکثرت ذکر ہے اور یہ ہر وہ گناہ ہے جس کا قبح شدید ہو۔''

اب دیکھنا چاہیے کہ فحش وفحشاء اور فاحشہ کا اطلاق کتاب وسنت میں کن کن برائیوں پر کیا گیا ہے:

زنا

زنا ایک ایسی برائی ہے جس کے گناہ کبیرہ اور سخت قبیح برائی ہونے پر دنیا کے تمام مذاہب متفق ہیں اور کوئی انسان جس نے اپنی فطرت کو مسخ نہ کرلیا ہو، اس کے فعل بد ہونے میں شک وشبہ نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ فاحشہ بکثرت زنا کے معنی میں مستعمل ہے، بلکہ زنا کا ایک نام فاحشہ بھی ہے۔ قرآن نے صراحۃً زنا کو فاحشہ کہا ہے:

وَ لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ○ (بنی اسرائیل:۳۲)

''زنا کے قریب نہ جاؤ، بلاشبہ وہ فاحشہ (بہت برا فعل) ہے اور بڑا ہی برا راستہ۔''

''زنا کے قریب نہ جاؤ'' حرمت زنا کے اس طرزِ تعبیر نے زنا کو تو حرام قرار دیا ہی، اس کے ساتھ کھلا اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ انسان کو دواعی زنا سے بھی اجتناب کرنا چاہیے، یعنی ہر ایسی چیز سے دور بھاگنا چاہیے جو زنا کی طرف لے جانے والی ہو۔

وَ الّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ
(النسآء:۱۵)

''تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو۔''

اس آیت میں بھی فاحشہ کا لفظ زنا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جاہلیت عرب میں زنا کی کثرت اس حد تک جا پہنچی تھی کہ بہت سے جاہل عرب اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ محرمات سے زنا کی شناعت وقباحت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زنا کے لیے قرآن میں فاحشہ کے ساتھ مقت کا لفظ بڑھایا گیا ہے:

وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ○ (النسآء:۲۲)

''اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے ہرگز نکاح نہ کرو، مگر جو ہو چکا ہو چکا۔ بے شک یہ بہت برا فعل اور غضب الٰہی کا سبب اور برا چلن ہے۔''

یہ بات معلوم ہے کہ زنا اسلامی قانون میں ایک شدید جرم ہے اور اس کی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ سزا کی تفصیل جاننے کے لیے قرآن کی تفسیریں اور فقہ کی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ جیسا کہ پہلے لغت کی تصریح گزر چکی کہ فاحشہ اور فحشاء دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، اس لیے فحشاء کا اطلاق بھی زنا پر ہوتا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو جب زنا کی انتہائی شدید ترغیب کے باوجود بچا لیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ ؕ (یوسف:۲۴)

''ایسا ہوا تا کہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی (زنا) کو دور کر دیں۔''

عملِ قومِ لوط

دنیا میں سب سے پہلی قوم جس کی صنفی انارکی ہم جنسی کی لعنت تک جا پہنچی، وہ قوم لوط ہے۔ اس قوم کے مرد، مردوں سے اپنی صنفی شہوت کی آگ بجھانے لگے۔ چوں کہ یہ غیر فطری فعل ہے اور یہ قوم سب سے پہلے اس کی مرتکب ہوئی اس لیے یہ لعنت اس کے نام کے ساتھ چپک کر رہ گئی اور اس فعل کو ظاہر کرنے کے لیے عمل قوم لوط کی تعبیر اختیار کر لی گئی۔ کوئی شخص اگر اس بدفعلی کا عادی ہوتو اسے لوطی کہنے لگے اور اس بدفعلی کا دوسرا نام لواطت قرار پایا۔ اس بدفعلی کے فحشاء اور فاحشہ ہونے میں کیا شبہ ہے۔ قرآن نے اس قوم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا:

> وَ لُوْطاً اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ○ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ○ (الاعراف:۸۰-۸۱)

> ’’اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسے بے حیا ہوگئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو۔ جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔‘‘

شیطان جب کسی فرد یا کسی قوم کو اپنا آلۂ کار بنا کر اس سے کسی برائی و بدکاری کا ارتکاب کراتا ہے تو پھر وہ اسی قوم تک محدود نہیں رہتی، بلکہ وہ اسے دنیا بھر میں پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ چناں چہ سدوم اور عمورہ میں بسنے والی قوم کی یہ بدکاری بھی محدود نہ رہی اور آج تو یہ ایک وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے، بلکہ یورپ کے بہت سے گندہ فطرت لوگ اس کی حمایت میں باضابطہ پروپیگنڈہ کر رہے ہیں۔ جس جرم کی پاداش میں قوم لوط پر آسمان سے پتھر برسے اور اس کا پورا علاقہ تلپٹ کر دیا گیا، اس کی حرمت، شناعت اور قباحت میں اگر کسی کو شبہ ہوتو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے قوم لوط ہی کی طرح اپنی فطرت کو مسخ کر لیا ہے۔ جس طرح اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اپنی مملکت کو زنا سے پاک رکھنے کی سعی کرے اسی طرح اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اس بدکاری سے بھی اسے صاف رکھے۔ اسلامی شریعت میں اس جرم کی بھی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔ فقہائے امت کی اکثریت کے نزدیک اس کی سزا قتل ہے۔

برہنگی و عریانی

عورت و مرد کو زنا میں مبتلا کرنے والے جتنے محرکات ہیں ان میں شدید ترین محرک برہنگی و عریانی اور بے پردگی ہے۔ حیاو شرم انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام مہذب انسان ستر پوشی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی فرد برہنگی و عریانی اختیار کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بے حیا ہو گیا ہے اور بے حیائی کے بعد ہر برائی اس سے متوقع ہے۔ لیکن شیطان کا کمال یہ ہے کہ وہ انسانوں کو نہ صرف یہ کہ اس بے حیائی میں مبتلا کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات وہ اسے مذہبی تقدس بھی عطا کر دیتا ہے۔ جاہلیت میں غیر قریشی قبیلوں کے بہت سے مرد و عورت کعبہ کا برہنہ ہو کر طواف کرتے تھے اور اس فعل کو ان کے نزدیک ایک مذہبی تقدس حاصل تھا۔ قرآن نے اس کا سخت انکار کیا اور اس فعل کو فاحشہ قرار دیا:

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لاَ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لاَ تَعْلَمُوْنَ○ (الاعراف:۲۸)

”یہ لوگ جب کوئی شرم ناک کام کرتے تھے تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو: اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے ہیں۔“

اس آیت میں فاحشہ اور فحشاء کا اطلاق برہنہ طواف پر کیا گیا ہے۔ اسلامی شریعت میں ستر پوشی واجب ہے۔ جن اعضاء کو چھپانا شرعاً ضروری ہے انہیں دوسروں کے سامنے کھولنا گناہ کبیرہ ہے، الاّ یہ کہ مجبوری کی حالت میں کسی طبیب اور ڈاکٹر کے سامنے کھولنے کی ضرورت پڑ جائے۔ آج ہم سب کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ زنا کو وبا کی طرح جن اسباب نے پھیلا دیا ہے ان میں برہنگی اور عریانی ایک بڑا سبب ہے۔

ایسا لباس جو جسم کے نشیب و فراز کو نمایاں کرے، یا اتنا باریک ہو کہ ستر پوشی نہ کر سکے، عریانی ہی میں داخل ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان معاشرے میں بھی اس طرح کے لباسِ عریانی کا رواج بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

بخل

انسان کے مال میں اللہ اور بندوں کے جو واجب حقوق ہیں ان کو ادا نہ کرنا بخل ہے۔ اگر مال دار ہونے کے باوجود کوئی شخص زکوۃ نہیں دیتا، قربانی نہیں کرتا تو ایسا شخص شرعی اصطلاح میں بخیل کہا جائے گا۔

بخل تمام شریف اور نیک فطرت انسانوں کے نزدیک سخت عیب اور کھلی ہوئی برائی ہے۔ بخیل انسانی معاشرے میں ایک مذموم اور ناپسندیدہ شخص سمجھا جاتا ہے۔ کلامِ عرب میں بخیل کے لیے فاحش کا لفظ استعمال ہے اور قرآن میں بھی بخل پر فحشاء کا اطلاق موجود ہے۔ متعدد آیات میں مسلمانوں کو صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم اور ترغیب دینے کے بعد کہا گیا ہے:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝ (البقرۃ:۲۶۸)

”شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرم ناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔“

اس آیت میں فحشاء کا لفظ بخل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ دین کو سربلند کرنے اور سربلند رکھنے کے لیے بھی مال کی ضرورت ہے۔ اگر عام طور سے مال دار، صاحب نصاب مسلمان اپنی مٹھی بند کرلیں، وہ نہ دین کی سربلندی کی راہ میں پیسے خرچ کریں اور نہ حاجت مند لوگوں کے مالی حقوق ادا کریں تو اس کا نتیجہ دینی و دنیوی ہلاکت کے سوا اور کیا نکلے گا؟ شیطان چوں کہ مسلمانوں کا سخت ترین دشمن ہے، اس لیے وہ مال داروں کو بخل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ اس آیت میں تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ کی مغفرت، اس کے فضل و کرم، اس کے وسیع خزانے اور محیط علم پر یقین و اعتماد کر کے اس شیطانی تسویل و ترغیب کو رد کر دینا چاہیے۔ اس کے بغیر فلاحِ دارین کا حصول ممکن نہیں ہے۔

تہمتِ زنا

تہمتِ زنا پر بھی قرآن میں فاحشہ کا اطلاق کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ

فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (النور:۱۹)

''جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔''

جس طرح زنا ایک سخت برائی اور معاشرے کو بگاڑنے والی چیز ہے، اسی طرح پاک باز مرد و عورت پر زنا کی تہمت بھی سخت برائی ہے اور اس سے بھی معاشرے میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اس جرم کی بھی ایک سخت حد مقرر کی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مسلمان مرد یا عورت پر زنا کا اتہام لگائے اور پھر اسے چار گواہوں سے ثابت نہ کر سکے تو اسلامی عدالت ایسے شخص پر اسّی کوڑوں کی حد جاری کرے گی۔ زنا کی حد قرآن میں سو کوڑے بیان کی گئی ہے اور قذف یعنی زنا کے اتہام کی حد اسّی کوڑے۔ زنا کی حد سے صرف بیس کوڑے کم۔ لیکن اس کے علاوہ ایسے شخص کو قرآن نے ایک اور سزا دی ہے اور وہ یہ کہ آئندہ کسی مقدمے میں اس کی گواہی قابلِ قبول نہ ہوگی۔ وہ سوسائٹی میں ایک ساقط الاعتبار شخص قرار پائے گا۔ یہ سزا کوڑوں کی سزا سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ تہمتِ زنا اللہ کے نزدیک کس درجے کی برائی ہے۔

راجح تفسیر کی بنا پر سورۂ نور کی مذکورہ بالا آیت میں فاحشہ کا لفظ تہمتِ زنا کے لیے استعمال ہوا ہے۔

بدکلامی و زبان درازی

فاحشہ کا اطلاق بدکلامی اور زبان درازی پر بھی کیا گیا ہے۔ سورۂ طلاق میں ہے:

لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَ لَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (الطلاق:۱)

''ان عورتوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود نکلیں، الّا یہ کہ وہ صریح بے حیائی کریں۔''

اس آیت میں یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ جس عورت کو طلاق دی گئی ہو اس کو عدت کے ختم ہونے تک شوہر ہی کے گھر میں قیام کرنا چاہیے۔ نہ شوہر کو حق ہے کہ اس کو اپنے گھر سے باہر نکالے اور نہ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی مرضی سے نکلے۔ ہاں اگر وہ عورت کسی کھلی بے حیائی کا ارتکاب کرے تو پھر اسے گھر سے نکال دینا جائز ہوگا۔ وہ فاحشہ مبینہ (کھلی بے حیائی) کیا ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ ایک جماعت نے متعدد طریقوں سے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر 'بدکلامی و زبان درازی' سے کرتے تھے۔ اس کی تائید حضرت ابی بن کعبؓ کی ایک قراءت سے بھی ہوتی ہے۔ وہ اس آیت میں اِلَّآ اَنْ يَّفْحُشْنَ

عَلَيْكُمْ کی قراءت کرتے تھے۔ یعنی ان کو گھر سے نکالنا اس وقت جائز ہوگا جب وہ تم سے بدکلامی وزبان درازی کرنے لگیں اور ہر وقت کی تو تو میں میں شروع ہو جائے۔

اس تفسیر کی تائید حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ طلاق کے بعد ان کو شوہر کے گھر سے نکلنے کی اس لیے اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ شوہر کے رشتہ داروں سے جھگڑنے لگی تھیں۔ فاحشہ مبینہ کے بارے میں دوسری تفسیریں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

۱- بلا عذر مطلقہ عورت کا شوہر کے گھر سے نکل جانا ہی فاحشہ مبینہ ہے۔ عبدالرزاق، عبداللہ بن حمید، ابن المنذر، بیہقی، ابن مردویہ اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہی تفسیر روایت ہے اور اسی کو سدی، ابن السائب، امام نخعی اور امام ابوحنیفہ نے اختیار کیا ہے۔

۲- اس سے مراد زنا ہے۔ یہ تفسیر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے اور اسی کو قتادہ، حسن بصری، شعبی، زید بن اسلم، ضحاک، عکرمہ، حماد، لیث اور امام ابو یوسف نے اختیار کیا ہے۔

۳- حضرت سعید بن المسیب کا خیال ہے کہ اس لفظ سے کوئی ایک برائی مراد نہیں ہے، بلکہ ہر کھلی برائی مراد ہے۔ اوپر بیان کی ہوئی برائیوں کے علاوہ ان کے نزدیک اس سے ہر ایسی برائی مراد ہے جس پر حد ہے، جیسے چوری وغیرہ۔ اسی رائے کو امام طبری نے اختیار کیا ہے۔

۴- نشوز (شوہر کی نافرمانی) اور بدخلقی۔ یہ تفسیر حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اور قتادہ کا بھی ایک قول ہے۔

ان تفسیروں سے معلوم ہوا کہ حسبِ ذیل برائیوں پر فاحشہ کا اطلاق صحیح ہے:

بدزبانی و بدکلامی، زنا، مطلقہ عورت کا بغیر عذر عدت ختم ہونے سے پہلے شوہر کے گھر سے نکلنا، چوری، قذف (کسی پر زنا کا اتہام لگانا)، شراب نوشی، نشوز اور بدخلقی۔

فواحش کی کلّی تحریم

سورۂ نحل کی آیت ۹۰ کے علاوہ دوسری آیات میں بھی فواحش کی کلّی تحریم فرمائی گئی ہے، یعنی ہر صریح بے حیائی (فاحشہ) کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

سورۂ انعام میں ہے:

وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ (الانعام:۱۵۱)

''اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی۔''

وَ لَا تَقْرَبُوْا کے صیغے نے تو یہ بتایا کہ ہر ایسی چیز سے بھی دور بھاگنا چاہیے جو کسی بے حیائی میں مبتلا کرنے والی ہو۔ اس میں بے حیائی پر ابھارنے والے اشعار، افسانے، ڈرامے، ناول، فلمیں اور عریاں تصاویر داخل ہیں۔ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک یہ کہ جلوت اور خلوت، ہر جگہ بے حیائی کے کاموں سے بھاگنا چاہیے۔ دوسری یہ کہ فواحش کا ارادہ بھی نہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ کسی بے حیائی کے کام کا ارادہ اور اس کی نیت چھپا ہوا فاحشہ ہے۔ اس سے بھی مومن کے دل و دماغ کو پاک ہونا چاہیے۔ بے حیائی کے وسوسے اور محض خیال پر تو گرفت نہیں ہے، لیکن اگر وہ خیال ارادہ اور نیت بن جائے تو اس پر گرفت ہے۔ سورۂ اعراف کی میں فرمایا:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ (الاعراف:۳۳)

"(اے محمد ﷺ) ان سے کہو کہ میرے رب نے بے حیائی کے کام حرام کیے ہیں، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔"

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"کوئی بھی اللہ سے زیادہ غیور نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس نے بے حیائی کے کاموں کو حرام قرار دیا ہے، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے۔" (بخاری و مسلم)

ایک بار حضرت سعد بن عبادہؓ نے فرمایا کہ اگر میں اپنی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو دیکھ لوں تو اس کو بلا تامل قتل کر دوں۔ جب یہ بات حضورؐ تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا:

"کیا تمہیں سعد کی غیرت پر تعجب ہے۔ واللہ میں سعد سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے زیادہ غیور ہے۔ اسی وجہ سے اس نے ظاہری و باطنی ہر طرح کے فواحش کو حرام کیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

سورۂ انعام اور سورۂ اعراف کی ان دو آیتوں نے زنا، تہمتِ زنا، عملِ قومِ لوط، چوری، شراب نوشی اور اس طرح کے دوسرے جرائم کی حرمت میں مزید تاکید پیدا کر دی، کیوں کہ ان جرائم کے فواحش ہونے میں کسی سلیم الفطرت انسان کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

احادیث میں فواحش کی شناعت

احادیث میں بھی فواحش کی قباحت و شناعت بہ کثرت آئی ہے۔ ان میں جن چیزوں پر صراحۃً فواحش کا اطلاق کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

حضرت عمران بن حصینؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: زانی، چور اور شرابی کے

بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟ صحابہ نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ آپ نے فرمایا:
''زنا، چوری اور شراب خوری 'فواحش' ہیں اور یہ مستوجب سزا جرائم ہیں۔'' (السنن الکبریٰ للبیہقی)

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے:

''بھیک مانگنا فواحش میں ہے۔'' (تفسیر ابن ابی حاتم)

کسی کی تکلیف دہ بات کے جواب میں تعدی (زیادتی) اختیار کرنے پر بھی فحش کا اطلاق حدیث میں ملتا ہے:

''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک بار کچھ یہودی نبی ﷺ کے پاس آئے اور کہا: ''السام علیکم'' (تم پر موت)۔ آپ نے جواب میں فرمایا: ''علیکم'' (تم لوگوں پر)۔ حضرت عائشہؓ نے یہودیوں کے جواب میں کہا: تم پر موت اور اللہ کی لعنت اور اس کا غضب۔'' یہ سن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ٹھہر جاؤ اے عائشہ، نرمی اختیار کرو اور سختی اور فحش سے پرہیز کرو۔ انہوں نے عرض کی: کیا آپ نے ان کی بات نہیں سنی؟ آپ نے فرمایا: کیا تم نے وہ بات نہیں سنی جو میں نے کہی۔ میں نے بھی ان کا قول ان پر پلٹ دیا۔ ان کے بارے میں میری بات قبول کر لی جائے گی اور میرے بارے میں ان کی بات اللہ قبول نہیں فرمائے گا۔'' (بخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چوں کہ جواب میں اللہ کی لعنت اور غضب کا اضافہ کر دیا تھا، اس لیے حضورؐ نے تنبیہ فرمائی۔ جواب میں جو تعدی (زیادتی) ہو گئی تھی اسی کو اس حدیث میں فحش کہا گیا ہے۔

۲- المنکر

منکر وہ دوسری چیز ہے جس سے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو روکا ہے۔ منکر کی تعریف لسان العرب میں یہ ہے:

كل ما قبّحه الشرع و حرّمه و كرّهه فهو منكر

''ہر وہ چیز جسے شریعت نے قبیح، حرام اور مکروہ قرار دیا ہو وہ منکر ہے۔''

منکر کی تعریف میں امام راغب نے اتنا اضافہ اور کیا ہے کہ ہر وہ فعل جسے عقل صحیح قبیح قرار دیتی ہے وہ بھی منکر ہے۔ اسی لیے منکر کا اطلاق ہر ایسی برائی پر بھی ہوتا ہے جسے لوگ عام طور پر برا جانتے ہیں، لیکن اس کو جاننے کی اصل کسوٹی شریعت ہی ہے۔ کیوں کہ عقل میں خلل بھی ہوتا ہے

اور خواہشِ نفس سے مغلوب عقل برائی کو بھلائی بھی قرار دے سکتی ہے۔

لغوی حقیقت کے لحاظ سے اس لفظ میں جہالت و ناواقفیت اور عدم معرفت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر ایسا فعل جو عقل سلیم کے نزدیک غیر معروف، مجہول اور اجنبی ہو، منکر ہے۔ اسی لیے لغت میں منکر کے لیے 'ضد المعروف' کی تشریح بھی ملتی ہے، یعنی منکر ہر ایسی چیز کو کہتے ہیں جو جانی پہچانی چیز کی ضد ہو۔ معروف وہ ہے جسے ہم جانتے پہچانتے ہیں اور منکر وہ ہے جسے ہم نہیں جانتے۔ یہ لغوی حقیقت قرآن میں کئی جگہ استعمال ہوئی ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے:

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَ هُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ○ (یوسف:۵۸)

''اور یوسف کے بھائی مصر آئے اور اس کے یہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا اور وہ لوگ اس سے نا آشنا تھے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو ان کا منکر اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے بھائی یوسف کو پہچان نہ سکے تھے۔

شرعی معنی کے لحاظ سے معروف کے دائرے میں ایمان و اسلام سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی نیکی تک داخل ہے۔ اسی طرح منکر کے احاطے میں کفر و شرک سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی برائی تک داخل ہے۔ منکر کا تعلق دل، زبان اور دوسرے اعضاء و جوارح سب سے ہے۔ برے عقائد و افکار، برے اعمال و افعال اور برے الفاظ و اقوال سبھی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بلکہ کسی چھپی ہوئی برائی کی ظاہری علامت کو بھی منکر کہتے ہیں۔ اس سلسلے کی چند آیتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ قومِ لوط کے بارے میں کہا گیا ہے:

وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ (العنکبوت:۲۹)

''اور تم اپنی مجلسوں میں منکر کا ارتکاب کرتے ہو۔''

حضرت ام ہانیؓ سے روایت ہے:

قَالَتْ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ قَالَ يَخْذِفُوْنَ اَهْلَ الطَّرِيْقِ وَ يَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ (ترمذی، احمد)

''کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے وَ تَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ کی آیت کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے فرمایا: وہ راہ گیروں پر کنکری مارتے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔''

اس حدیث میں جن دو چیزوں کو منکر کہا گیا ہے ان میں ایک کا تعلق فعل سے ہے اور

دوسرے کا قول سے۔ اس آیت کی تفسیر میں مختلف ائمۂ تفسیر کے حسب ذیل اقوال بھی ملتے ہیں:
ہوا خارج کر کے ہنسنا، مینڈھے اور مرغ لڑانا، کبوتر بازی، سیٹی بجانا، گوپھن سے پھینک کر پتھر مارنا۔

بنی اسرائیل کے ملعون ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ط (المائدۃ:۷۹)

''انہوں نے ایک دوسرے کو برے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔''

اس آیت میں منکر کا لفظ اگرچہ عام ہے، لیکن مفسرین نے چند چیزوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔
(۱) سنیچر کے دن مچھلی کا شکار (۲) رشوت خوری (۳) سود خوری (۴) حرام چربی بیچ کر اس کی قیمت کا استعمال۔

سورۂ مجادلہ میں ظہار کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

وَ اِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ط (المجادلۃ:۲)

''اور بے شک وہ ایک ناپسندیدہ اور جھوٹی بات بولتے ہیں۔''

ظہار یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی بیوی سے کہے: اَنْتِ عَلَيَّ كَظَهْرِ اُمِّيْ ''تو مجھ پر میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہے۔'' اس آیت میں ظہار کے الفاظ کو صراحۃً منکر اور جھوٹ کہا گیا ہے۔ (ظہار کے مسئلے کو فقہ کی کتابوں میں دیکھنا چاہیے)

فحشاء اور منکر میں فرق

جن جن چیزوں پر فحشاء اور فاحشہ کا اطلاق ہوتا ہے اور جن جن چیزوں پر منکر کا اطلاق ہوتا ہے، انہیں دیکھتے ہوئے بظاہر ان دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، لیکن فی الواقع ان دونوں میں فرق ہے۔ بات یہ ہے کہ کسی لفظ کے ایک معنی تو وہ ہوتے ہیں، جس کے لیے وہ وضع کیا گیا ہو۔ یہی معنی اس لفظ کا حقیقی معنی ہوتا ہے اور پھر وہ لفظ کسی مناسبت کی وجہ سے بہت سے دوسرے معانی میں استعمال ہونے لگتا ہے۔ یہ دوسرے معانی حقیقی معانی نہیں ہوتے، بلکہ مجازی ہوتے ہیں۔
فحشاء کے حقیقی معنی میں بے حیائی اور بے شرمی کا مفہوم پایا جاتا ہے جب کہ منکر کے حقیقی معنی میں بے حیائی کا مفہوم داخل نہیں ہے، بلکہ اس لفظ کی لغوی حقیقت میں عدمِ معرفت اور انکار کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اسی حقیقی معنی کے لحاظ سے یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں اور

اسی جہت سے منکر کا لفظ فحشاء کے مقابلے میں زیادہ عام ہے۔ ہر فحشاء منکر بھی ہے، لیکن ضروری نہیں کہ ہر منکر پر فحشاء اور فاحشہ کا اطلاق بھی صحیح ہو۔ مثال کے طور پر جانوروں کو آپس میں لڑانا منکر تو ہے، لیکن اس پر فاحشہ کا اطلاق صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

فحشاء و منکر سے بچنے کی تدبیر

انسان کے ساتھ اس کا اپنا نفس اور شیطان دو بڑے دشمن لگے ہوئے ہیں، جو شرم ناک اور برے کاموں کے ارتکاب پر اکساتے رہتے ہیں۔ شیطان کے بارے میں تو صراحۃً یہ کہا گیا ہے کہ وہ فحشاء و منکر کا حکم دیتا ہے: فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (النور:۲۱) ''بلاشبہ شیطان فحشاء اور منکر کا حکم دیتا ہے۔'' یہ بات مسلمانوں کو شیطان کی پیروی سے روکتے ہوئے کہی گئی ہے۔ ان دو دشمنوں کے اغوا اور ان کی ترغیب کے نتیجے سے انسان کس طرح بچے اور فحشاء و منکر سے حفاظت کی تدبیر کیا ہو؟ قرآن نے اس سوال کے جواب میں نماز کو پیش کیا ہے۔ نماز وہ تدبیر ہے جس کے ذریعے انسان شرم ناک اور برے افعال سے اپنا دامن بچا سکتا ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (العنکبوت:۴۵) ''بلاشبہ نماز فحش اور برائی سے روکتی ہے۔'' نماز بے حیائیوں اور برائیوں سے کس طرح روکتی ہے اور کس نماز کا یہ خاصہ ہے اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے۔ یہاں مزید اتنی بات اور لکھی جاتی ہے کہ یہ خاصہ ہر نماز کا نہیں ہے، بلکہ اس نماز کا ہے جس میں یہ چار باتیں پائی جائیں:

(۱) حضورِ قلب (۲) خشوع (۳) محافظت (۴) مداومت۔

حضورِ قلب کے معنی یہ ہیں کہ نماز غافل دل کے ساتھ نہ پڑھی جائے، بلکہ نمازی کا دل خدا کے دربار میں حاضر ہو اور اس کی نماز خدا کی یاد سے بھری ہوئی ہو۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ:۱۴) ''میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔''

خشوع کے معنی یہ ہیں کہ نمازی کا دل خدا کی عظمت و جلال کے سامنے جھکا ہوا ہو، وہ خدا کے سامنے اس طرح کھڑا ہو جیسے ایک حقیر غلام اپنے باجبروت آقا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ (المومنون:۲) ''جو لوگ اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔''

محافظت کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی تمام چیزوں سے اپنی نماز کی حفاظت کرے جو اسے خراب کرنے والی ہوں۔ نماز کے اندر بھی اور نماز سے باہر بھی۔ نیز یہ کہ ایسی تمام چیزوں کا

التزام کرے جن سے وہ درجۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ ان میں سے ایک اہم چیز یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا التزام کیا جائے: وَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (المومنون:۹)
''اور جو لوگ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔''

مداومت کے معنی یہ ہیں کہ نماز پابندی کے ساتھ ہمیشہ پڑھی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کبھی نماز پڑھی اور کبھی نہیں پڑھی۔ اَلَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (المعارج:۲۳) ''جو لوگ اپنی نماز پر قائم دائم رہتے ہیں۔''

یہ ہے وہ نماز جو بے حیائیوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔ جن لوگوں کی نمازوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں، آج بھی مشاہدہ ہے کہ ان سے دوسروں کے مقابلے میں فواحش کا ارتکاب بہت کم ہوتا ہے اور جو لوگ پنج وقتہ نمازیں بھی ادا کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فواحش و منکرات میں بھی مبتلا ہیں، ان کی نمازیں حقیقی نمازیں نہیں ہیں، محض رسمی ہیں۔

۳- البغی

تیسری چیز، جس سے سورۂ نحل کی آیت ۹۰ میں روکا گیا ہے، بغی ہے۔ لغوی اعتبار سے بغی کی اصل اپنی حد سے تجاوز کرنا ہے۔ لسان العرب میں ہے: اصل البغی مجاوزۃ الحد ''لفظ بغی کی اصل حد سے تجاوز کرنا ہے۔'' صحاح جوہری میں ہے: کسی شے کی جو محدود مقدار مقرر ہے اس میں افراط پیدا کرنا اور اس مقررہ حد سے تجاوز کرنا، بغی ہے۔ اسی لغوی معنی کے لحاظ سے کسی دوسرے شخص یا اشخاص کی جان، مال اور عزت و آبرو پر دست درازی کو بغی کہتے ہیں۔ اس لفظ کا غالب استعمال حقوق العباد میں دست درازی ہوتا ہے۔ اس آیت میں بھی بغی سے مراد ظلم و زیادتی اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ عام طور سے علٰی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ ص میں ہے:

خَصْمَانِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ (آیت:۲۲)
''ہم دو فریق ہیں، ہم میں سے بعض نے بعض پر زیادتی کی ہے۔''

سورۂ قصص میں فرمایا گیا ہے:

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ (آیت:۷۶)
''قارون قوم موسیٰ کا ایک فرد تھا، پھر اس نے ان کے مقابلے میں ظلم و زیادتی اختیار کی۔''

سورۂ حجرات میں مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان جنگ ہو جانے کی صورت میں حکم دیتے ہوئے کہا:

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ (آیت:۹)

''پس اگر ان میں ایک جماعت دوسری کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرے تو سرکش و ظالم جماعت سے لڑو۔''

عَلٰى کے صلہ کے بغیر بھی یہ لفظ سرکشی اور ظلم و زیادتی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ سورۂ شوریٰ میں فرمایا:

وَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْىُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ (الشوریٰ:۳۹)

''اور وہ لوگ کہ جب ظلم و سرکشی سے دوچار ہوتے ہیں تو بدلہ لیتے ہیں۔''

سورۂ نحل کے علاوہ ایک اور مقام پر بھی بغی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس مقام کو بھی یہاں سامنے رکھنا چاہیے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّىَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْىَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (الاعراف:۳۳)

''کہہ دو کہ میرے رب نے بے حیائی کے کاموں کو حرام کیا ہے، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے اور اس نے گناہ کو حرام کیا ہے اور ناحق کی زیادتی کو۔''

فواحش، اثم اور بغی کی تحریم جس ترتیب سے اس آیت میں ہے، یہ ٹھیک وہی ترتیب ہے جو سورۂ نحل کی آیت ۹۰ میں اختیار کی گئی ہے اور معنوی اعتبار سے دونوں آیتیں ایک دوسرے کی نظیر ہیں۔ بغی کے ساتھ بغیر الحق کی قید ایک واقعی اور تاکیدی قید ہے، یعنی یہ واقعہ ہے کہ حقوق پر دست درازی، اپنی حد سے تجاوز اور ظلم بغیر حق ہی ہوتے ہیں، جیسے ایک دوسرے مقام پر کہا گیا ہے: وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ''اور انبیاء کو بغیر حق کے قتل کرتے ہیں۔'' ظاہر ہے کہ انبیاء کا قتل ناحق ہی ہو سکتا تھا، اس لیے یہ قید محض اظہارِ واقعہ کے لیے لگائی گئی ہے۔ میرے نزدیک بغی کے ساتھ بغیر الحق کی قید بھی اسی کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں بغی کا لفظ بغیر مفعول کے جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے، ظلم و سرکشی اور جائز حدود سے تجاوز ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اللہ کے فضل وکرم سے ہم آیت زیر بحث کے اوامر ونواہی کی مختصر توضیح وتشریح سے فارغ ہو گئے۔ آخر میں ان اوامر ونواہی کے حسن ترتیب کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اوامر کو عدل کے حکم سے شروع کیا گیا اور ایتاء ذی القربیٰ کے حکم پر ختم کیا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عدل واحسان کے دو عمومی حکم کے بعد حقوق العباد سے متعلق ایک خصوصی حکم دیا گیا ہے۔ اسی طرح نواہی کی ابتداء فحشاء کی نہی سے کی گئی اور اس کو بغی کی نہی پر ختم کیا گیا۔ یہاں بھی فحشاء اور منکر کی دو عام ممانعتوں کے بعد حقوق العباد سے متعلق ایک خاص ممانعت کی گئی۔ اس طرح خاص حکم اور خاص نہی سے حقوق العباد کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھنے کی چیز ہے کہ اوامر کی ابتدا عدل اور نواہی کی انتہا ظلم وزیادتی (بغی) پر کر کے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ تمام نیکیوں کی اصل عدل ہے اور تمام برائیوں کی جڑ ظلم ہے۔ اسی کے ساتھ اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جب تک انسان بغی کو ترک نہ کرے وہ فحشاء ومنکر سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتا، کیوں کہ ہر فاحشہ اور ہر منکر کے ارتکاب کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی حد بندگی سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اس طرح بغی سے روک کر فحشاء ومنکر کے اصل سبب کی ممانعت کر دی گئی۔

تکمیلی فقرہ

یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ''اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، تاکہ تم سبق لو'' اس جامع آیت کا تکمیلی فقرہ ہے۔ قرآن حکیم کا عام اسلوب یہ ہے کہ آیتوں کو ایسے فقروں پر ختم کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام ومطالبات کی حیثیت اور ان کی غرض وغایت واضح کر دیتے ہیں۔ احکام ومطالبات سننے اور جاننے کے بعد یہ تکمیلی فقرے انسان کے اندر انہیں ماننے اور ان پر عمل کرنے کا داعیہ اور بڑی ترغیب پیدا کرتے ہیں۔ یہ تکمیلی فقرہ ایک بات تو یہ واضح کرتا ہے کہ ان اوامر ونواہی کی حیثیت ونوعیت نصیحت اور خیر خواہی کی ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کی غرض وغایت یہ ہے کہ انسان سبق لے اور غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام ومطالبات اس لیے نہیں ہیں کہ ان سے اس کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، بلکہ صرف اس لیے ہیں کہ ان سے اس کے بندوں کی زندگیاں سنورتی اور کامیاب ہوتی ہیں۔

مولانا سید احمد قادری معروف بہ عروج قادریؒ (۱۹۱۱-۱۹۸۶) تحریک اسلامی کے نامور صاحبِ قلم، عظیم فقیہ اور ممتاز عالم دین تھے۔ تفقہ و بصیرت، وسعت فکر و نظر اور موضوع کی جامعیت و ہمہ گیری ان کی تحریروں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

مولانا عروج قادری سادات کی قدیم بستی اُجھر شریف، بسن پورہ ضلع اورنگ آباد (بہار) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے والد محترم مولانا سید عبداللہ قادری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی، ثانوی تعلیم کے لیے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں داخلہ لیا اور وہیں سے سند فراغ حاصل کی۔

مولانا عروج قادریؒ نے عملی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے کیا۔ انھوں نے کچھ دنوں مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام میں تدریس کے فرائض انجام دیے، بعد میں اپنی مادر علمی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے وابستہ ہوئے اور وہاں وہ ۱۹۵۴ تک قرآن، حدیث اور فقہ کے استاذ رہے۔ وہ تحریک اسلامی کی صف اول کے قائدین میں تھے۔ وہ ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں، جن کو بانی تحریک مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے رکن پہلے بنایا تھا اور ان سے رکنیت کا فارم بعد میں پر کرایا۔ کچھ عرصے کے بعد اس وقت کے امیر جماعت اسلامی ہند محترم مولانا ابواللیث ندویؒ نے انھیں ثانوی درس گاہ کے لیے رام پور طلب فرمالیا، پھر ماہ نامہ ''زندگی'' رام پور کی ادارت کی ذمہ داری تفویض کر دی اور تادم آخر (۵ر فروری ۱۹۸۶ تک) وہ ''زندگی'' کے مدیر رہے۔

مولانا عروج قادریؒ نے ماہ نامہ ''زندگی'' میں قرآن، حدیث، ادب، سیرت، فقہ، فتاویٰ، تصوف اور دوسرے دینی موضوعات پر ہزاروں صفحات سپرد قلم کیے۔ شعر و ادب سے بھی گہرا تعلق تھا۔ ان کی تصانیف میں: اسلامی تصوف، احکام و مسائل (اول، دوم)، حضرت یوسفؑ قرآن کے آئینے میں، عشر و زکوٰۃ اور سود کے چند مسائل، تصوف کی تین اہم کتابیں، عقیدت و احترام، آداب ازدواج، عبادات اور اصلاح و تربیت، فسادات کا علاج، نفقۂ مطلقہ کا فیصلہ اور پارلیمنٹ میں بے جا وکالت اور اقامتِ دین فرض ہے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

MARKAZI MAKTABA ISLAMI PUBLISHERS
NEW DELHI
مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

₹95.00

PN- 1336